جمادی الاولیٰ ۱۴۳۲ھ

اپریل ۲۰۱۱ء

ماہنامہ

میثاق
لاہور

یکے از مطبوعات

تنظیم اسلامی

بانی: ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ علیہ

خصوصی مضمون

توبہ کی عظمت اور اُس کی تاثیر

بانی تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

بانی تنظیم اسلامی و داعی تحریک خلافت پاکستان

محترم ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ کے

2004ء میں دورۂ انڈیا کے دوران دیئے گئے خطبات کا مجموعہ

خطباتِ ہند

1 امت مسلمہ کا ماضی حال اور مستقبل
2 امت مسلمہ کے لیے تین نکاتی لائحہ عمل

1 عظمت قرآن
Duties of True Momin 2
(English)

1 نجات کی راہ
2 نیکی کا قرآنی تصور

1 حب رسول ﷺ کے تقاضے
2 نفاق کی حقیقت

1 ایمان اسلام اور اللہ کی راہ میں جدوجہد
2 حقیقت واقسام شرک

1 برصغیر میں دعوت اسلام کے لیے مواقع
2 راہ ہدایت: ایمان کے ضمن میں فطرت اور عقل کی راہنمائی

1 خلافت کی حقیقت
2 خلافت کا معاشی نظام
3 اسلام کا سماجی اور معاشرتی نظام
4 ڈاکٹر اسرار احمدؒ سے انٹرویو

7DVDs پر مشتمل سیٹ کی قیمت 420 روپے

مکتبہ خدام القرآن لاہور
K-36 ماڈل ٹاؤن، لاہور
فون: 3-35869501-42-92+
ای میل: maktaba@tanzeem.org ویب سائٹ: www.tanzeem.org

وَاذۡکُرُوۡا نِعۡمَۃَ اللّٰہِ عَلَیۡکُمۡ وَمِیۡثَاقَہُ الَّذِیۡ وَاثَقَکُمۡ بِہٖۤ ۙ اِذۡ قُلۡتُمۡ سَمِعۡنَا وَاَطَعۡنَا ۫ (المائدۃ: ۷)

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل اور اس کے میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے مانا اور اطاعت کی!

ماہنامہ میثاق لاہور

اجرائے ثانی

ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

جلد :	60
شمارہ :	4
جمادی الاُولیٰ	1432ھ
اپریل	2011ء
فی شمارہ	-/25

مُدیر
حافظ عاکف سعید

نائب مُدیر
حافظ خالد محمود خضر

سالانہ زرِ تعاون

❁ اندرون ملک	250 روپے
❁ بھارت و بنگلہ دیش	900 روپے
❁ ایشیا' یورپ' افریقہ وغیرہ	1200 روپے
❁ امریکہ' کینیڈا' آسٹریلیا وغیرہ	1500 روپے

ترسیل زر: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

مکتبہ خدام القرآن لاہور

مقام اشاعت: 36۔ کے ماڈل ٹاؤن' لاہور 54700' فون: 3-35869501
فیکس: 35834000 ای میل: publications@tanzeem.org
ویب سائٹ ایڈریس: **www.tanzeem.org**

مرکزی دفتر تنظیم اسلامی: 67۔ علامہ اقبال روڈ' گڑھی شاہو' لاہور
فون: 36366638 - 36316638 فیکس: 36271241

پبلشر: ناظم مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور
طابع: رشید احمد چوہدری مطبع: مکتبہ جدید پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ

مشمولات

❁ **عرضِ احوال** ———— 3
لوٹ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایّام تو!
حافظ عاکف سعید

❁ **بیانُ القُرآن** ———— 6
سورۃ الانعام (آیات ۹۵ تا ۱۲۱)
ڈاکٹر اسرار احمد

❁ **تذکرہ و تبصرہ** ———— 27
توبہ کی عظمت اور اُس کی تاثیر
ڈاکٹر اسرار احمد

❁ **یادِ رہبر** ———— 65
میں نے اپنے استادِ مکرم سے کیا سیکھا؟
شاہدہ شوکت ظفر

❁ **افکار و آراء** ———— 83
یہ ایک شخص کی نہیں، پوری قوم کی دیت ہے
ابوالحسن علوی

❁ **نقد و نظر** ———— 88
مصطفیٰ کمال پاشا
حافظ محمد زبیر

❁❁❁

بسم اللہ الرّحمٰن الرّحیم

لوٹ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایام تُو!

۲۳/مارچ ۱۹۴۰ء کا دن یقیناً مسلمانانِ برصغیر کے لیے ایک تاریخ ساز دن تھا' بلکہ اگر یوں کہا جائے کہ اس دن نے برصغیر کی تاریخ کا رُخ موڑ دیا تو کوئی مبالغہ نہیں ہوگا۔ اس روز منظور ہونے والی قرارداد کے حوالے سے کچھ عرض کرنے سے پہلے اس گھپلے کا ذکر کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے جو اس دن کو منانے کے حوالے سے ایک فوجی آمر نے کیا' تاکہ قارئین جان سکیں کہ ہمارے حکمران کس کس انداز میں عوام کی آنکھوں میں دھول جھونکتے اور اپنا اُلّو سیدھا کرتے رہے ہیں۔ قصّہ کچھ یوں ہے کہ ۱۹۵۶ء میں پاکستان کا پہلا آئین اُس وقت کے وزیراعظم چودھری محمد علی نے قومی اسمبلی سے منظور کروایا۔ حسنِ اتفاق سے یہ بھی ۲۳/مارچ کا دن تھا۔ آئین کی منظوری کے بعد اس دن کو ''یومِ جمہوریہ'' قرار دیا گیا اور عام تعطیل کا اعلان کر دیا گیا۔ اگلے دونوں سال ۱۹۵۷ء اور ۱۹۵۸ء میں بھی ''یومِ جمہوریہ'' زور وشور اور شان وشوکت سے منایا گیا' ملک بھر میں عام تعطیل ہوئی۔ لیکن اکتوبر ۱۹۵۸ء میں جنرل ایوب خان نے مارشل لاء لگا دیا۔ اسمبلیاں توڑ دی گئیں اور آئین کو منسوخ کر دیا گیا۔ جب ۱۹۵۹ء میں مارچ کے مہینے کا آغاز ہوا تو عوام کے لیے ۲۳/مارچ ایک یادگار دن کی حیثیت اختیار کر چکا تھا اور اُس روز عام تعطیل بھی معمول بن چکی تھی —— یاد رہے ۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۵ء تک ۲۳/مارچ کو کوئی عام تعطیل نہیں ہوتی تھی —— لیکن اب سوال یہ پیدا ہوا کہ ایک فوجی حکومت جس نے جمہوریت پر شب خون مارا تھا اور جمہوری آئین کو پھاڑ کر کوڑے دان میں پھینک دیا تھا وہ ''یومِ جمہوریہ'' کیسے منائے؟ لہٰذا عیار اذہان اور ناممکن کو ممکن کر دینے والی اسٹیبلشمنٹ نے ایک ہی تاریخ ہونے کی وجہ سے یوم جمہوریہ کو ''یومِ پاکستان'' کا نیا نام دیا۔ اسے ۱۹۴۰ء کی قرارداد سے جوڑا اور عام تعطیل جاری رکھ کر عوام کو بھی خوش کر دیا۔ مزید برآں اس روز فوجی پریڈ کے سلسلے کا آغاز کر کے ملکی سلامتی کا خوبصورت لبادہ بھی اوڑھا دیا گیا۔

تحریکِ پاکستان کا طائرانہ جائزہ لیا جائے تو ۱۸۵۷ء کی ناکام جنگ آزادی سے لے کر ۱۹۴۷ء کی حقیقی آزادی تک ہمیں چار ایسی مسلمان شخصیتیں نظر آتی ہیں جنہوں نے مختلف انداز میں اور مختلف سطحوں پر مسلمانوں کا مقدمہ انگریزوں اور ہندوؤں کے خلاف لڑا۔ ۱) سر سید احمد خان' ۲) مولانا محمد علی جوہر' ۳) محمد علی جناح' ۴) علامہ محمد اقبال۔ حیران کن بات یہ ہے کہ برصغیر کے

مسلمانوں کے یہ چاروں عظیم لیڈر ایک خاص وقت تک اور محدود عرصہ کے لیے ہمیں خالص نیشلسٹ دکھائی دیتے ہیں۔ علامہ اقبال پر ایک وقت وہ بھی تھا جب وہ کہتے ہیں ؏ ''سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا!'' اور محمد علی جناح کے سیاسی کیریئر کا آغاز ہی ہندو مسلم اتّحاد کے داعی کی حیثیت سے ہوا۔ مولانا محمد علی جوہر تحریک خلافت میں گاندھی کا تعاون حاصل کرتے ہیں اور گاندھی کی تحریک عدمِ تعاون میں ان کے ساتھ نظر آتے ہیں۔ یہ رہنما انگریز سے آزادی حاصل کرنے کے لیے بڑی دیانت داری اور اخلاص سے ہندو مسلم مشترکہ جدّوجُہد کے قائل تھے۔ لیکن یہ تینوں رہنما باری باری اور اپنے اپنے وقت میں اس نتیجہ پر پہنچے کہ ہندو ذہنیت بدل نہیں سکتی اور وہ مسلمان کے خلاف تعصّب سے نجات حاصل نہیں کر سکتا۔ ہمیں یہاں سر سید احمد خان کے صرف قومی کردار سے بحث کرنا ہے۔ انہوں نے مسلمان نوجوانوں کو تعلیم کی طرف متوجّہ کر کے سیاسی شعور اور آگاہی دی۔ ہماری رائے میں مسلم نوجوانوں کو یہ شعور اور آگاہی حاصل نہ ہوئی ہوتی تو وہ قائداعظم کی بات کو سمجھنے کے کبھی اہل نہ ہوتے۔ درحقیقت ہندو کے سینہ میں مسلمان کے خلاف زہر بھرا ہوا تھا' لہٰذا وہ تاریخ کے ہر موڑ پر مسلمان پر زہر بھرا نشتر چلانے سے باز نہ آیا۔

مؤرخین ۱۹۴۶ء کے انتخابات میں مسلم لیگ کی کامیابی کو حصولِ پاکستان کا زینہ قرار دیتے ہیں۔ یہ صدفی صد درست ہے کہ ۱۹۴۶ء کے انتخابات میں مسلم لیگ کی شاندار فتح پاکستان کے قیام کے حوالے سے فیصلہ کن ثابت ہوئی' لیکن یہ بھی نہیں بھولنا چاہیے کہ درحقیقت ۱۹۳۷ء کے انتخابات میں مسلم لیگ کی ناکامی اور کانگرس کی مکمل فتح نے مسلمان عوام اور لیڈران کے ذہن میں انقلابی تبدیلی پیدا کی اور وہ جان گئے کہ اگر انگریز کی ہندوستان سے روانگی کے بعد ان کو متعصّب اور منتقم مزاج ہندو کے رحم وکرم پر چھوڑ دیا گیا تو انہیں بدترین انتقامی کارروائیوں کا نشانہ بنایا جائے گا۔ ۱۹۳۷ء کے انتخابات میں ہندوستان کے گیارہ صوبوں میں کانگرس نے حکومت بنائی اور ان حکومتوں نے مسلمانوں سے وہ سلوک کیا کہ بہت سے مسلمان لیڈر جو ابھی تک کسی نہ کسی سطح پر ہندوؤں کے بارے میں خوش فہمی میں مبتلا تھے ان کے ذہن بھی واضح ہو گئے۔ یہ تھے وہ حالات جن کے پس منظر میں قراردادِ لاہور ۲۳/مارچ ۱۹۴۰ء کو پیش کی گئی۔ مسلم لیگ کا دو روزہ اجلاس ۲۲/مارچ کو منٹو پارک میں شروع ہوا۔ پارک کو انتہائی خوبصورتی سے سجایا گیا۔ صبح ہی صبح ہزاروں مسلمان جلسہ گاہ پہنچ گئے۔ وہ بڑی بے تابی سے اپنے قائد کا انتظار کر رہے تھے۔ قائداعظم محمد علی جناح دوپہر کو جلسہ گاہ میں پہنچے۔ ان کا استقبال نواب آف ممدوٹ نے کیا۔ انہیں پنڈال میں لایا گیا تو جلسہ گاہ زندہ باد کے واشگاف نعروں سے گونج اٹھی۔ قرارداد بنگال کے وزیراعلیٰ مولوی فضل الحق نے پیش کی۔ قرارداد میں صاف صاف کہہ دیا گیا کہ ایسا کوئی آئینی منصوبہ مسلمانوں کو منظور نہیں ہوگا جو اس بات کو مدِّنظر رکھ کر نہ بنایا گیا جس میں

مسلمان علاقے ضروری ایڈجسٹمنٹ کر کے مطلوبہ جغرافیائی حد بندی کے ساتھ الگ یونٹ نہ بنا دیے جائیں۔ یہ یونٹ یا ریاستیں خودمختار اور مقتدر ہوں۔

یہ بات نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ قراردادِ لاہور میں صاف صاف "Muslim States" کی اصطلاح استعمال کی گئی اور ''پاکستان'' کا لفظ بھی اس قرارداد میں موجود نہیں تھا۔ اس کے باوجود اگلے روز ہندو پریس چیخ اٹھا کہ مسلمانوں نے ''قراردادِ پاکستان'' منظور کر لی ہے۔ قائد اعظم ایک ذہین سیاست دان اور مدبّر انسان تھے۔ وہ صحیح وقت پر صحیح فیصلہ کرنے کا ہنر جانتے تھے۔ انہوں نے دشمن کی اس غلطی سے فائدہ اٹھایا اور مسلم لیگ نے ہندو پریس کی اس اختراع پر کوئی تردیدی بیان جاری نہ کیا۔ اور بات خود بخود ''لے کے رہیں گے پاکستان'' کی طرف چل پڑی۔ ۱۸۵۷ء سے لے کر ۱۹۴۷ء تک تاریخ ہندوستان کا جائزہ لیا جائے تو ہر قاری اس نتیجے پر پہنچے گا کہ مسلمانوں کو خود ہندوؤں نے ایک الگ آزاد اور خودمختار ریاست کی طرف دھکیلا۔ ہندوؤں کی منفی سوچ اور متعصبانہ کارروائیوں نے مسلمانانِ ہند کے ذہن میں یہ بات ڈال دی کہ آزاد ہندوستان میں مسلمانوں کی حیثیت ہندوؤں کے غلاموں کی سی ہوگی۔ یہ بات بھی ریکارڈ پر آنی چاہیے کہ ۱۹۴۶ء میں بنگال کے لیڈروں کی خواہش پر ۲۳/مارچ کی قرارداد میں ایک انقلابی تبدیلی کی گئی' یعنی Muslim States کا "s" کاٹ کر اسے Muslim State کیا گیا تاکہ پاکستان کے نام سے صرف ایک ریاست وجود میں لائی جا سکے۔ آل انڈیا مسلم لیگ نے جنم بھی ۱۹۰۶ء میں بنگال کے شہر ڈھاکہ میں لیا۔ بنگال کے نواب وقار الملک مسلم لیگ کے پہلے صدر بنے۔ بنگال کے وزیراعلیٰ مولوی فضل الحق نے ۲۳/مارچ ۱۹۴۰ء کو قراردادِ لاہور پیش کی جو بعد ازاں قراردادِ پاکستان بن گئی' لیکن انتہائی دکھ اور تکلیف دہ یہ بات ہے کہ اسی بنگال ہی کے لیڈر پاکستان سے مایوس ہوئے اور اسے دولخت کرنے میں مرکزی رول ادا کیا' جو یقیناً درست فیصلہ نہیں تھا' لیکن مغربی پاکستان کے لیڈران نے انہیں ایسا کرنے کا جواز فراہم کیا۔ مشرقی اور مغربی پاکستان میں اختلافات اتنے شدید کیوں ہوئے اور نوبت شکست و ریخت تک کیوں پہنچی' یہ ایک الگ موضوع ہے جس پر کسی دوسرے موقع پر روشنی ڈالی جا سکتی ہے۔ یہاں اتنا عرض کر دینا کافی ہوگا کہ مشرقی اور مغربی پاکستان کی زبان' ثقافت' بودوباش اور طرزِ معاشرت ہر شے مختلف تھی' صرف اسلام کا رشتہ تھا جس نے انہیں ایک لڑی میں پرو دیا تھا' لیکن قیامِ پاکستان کے بعد اسلام کو مکمل طور پر نظر انداز کر دیا گیا۔ چنانچہ جب دو اینٹوں کے درمیان سے سیمنٹ نکال دیا جائے گا تو ان کا الگ الگ ہونا فطری بھی ہے اور عقلی بھی۔ رشتہ و پیوند ختم ہو جائے تو بکھر جانا فطری ہوتا ہے' اسے روکا نہیں جا سکتا۔ اللہ کرے اب بھی ہم اس انتہائی اہم بات کو سمجھ جائیں تاکہ بقیہ پاکستان کو بچانے میں کامیاب ہو جائیں۔ آمین یا ربّ العالمین!

دورۂ ترجمۂ قرآن

ڈاکٹر اسرار احمد

سُورۃُ الانعام

آیت ۹۵ تا ۱۰۰

اِنَّ اللّٰهَ فَالِقُ الۡحَبِّ وَالنَّوٰى ؕ يُخۡرِجُ الۡحَىَّ مِنَ الۡمَيِّتِ وَمُخۡرِجُ
الۡمَيِّتِ مِنَ الۡحَىِّ ؕ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ فَاَنّٰى تُؤۡفَكُوۡنَ ﴿۹۵﴾ فَالِقُ الۡاِصۡبَاحِ ۚ
وَجَعَلَ الَّيۡلَ سَكَنًا وَّالشَّمۡسَ وَالۡقَمَرَ حُسۡبَانًا ؕ ذٰلِكَ تَقۡدِيۡرُ الۡعَزِيۡزِ
الۡعَلِيۡمِ ﴿۹۶﴾ وَهُوَ الَّذِىۡ جَعَلَ لَـكُمُ النُّجُوۡمَ لِتَهۡتَدُوۡا بِهَا فِىۡ ظُلُمٰتِ
الۡبَرِّ وَالۡبَحۡرِ ؕ قَدۡ فَصَّلۡنَا الۡاٰيٰتِ لِقَوۡمٍ يَّعۡلَمُوۡنَ ﴿۹۷﴾ وَهُوَ الَّذِىۡۤ اَنۡشَاَكُمۡ
مِّنۡ نَّفۡسٍ وَّاحِدَةٍ فَمُسۡتَقَرٌّ وَّمُسۡتَوۡدَعٌ ؕ قَدۡ فَصَّلۡنَا الۡاٰيٰتِ لِقَوۡمٍ
يَّفۡقَهُوۡنَ ﴿۹۸﴾ وَهُوَ الَّذِىۡۤ اَنۡزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ۚ فَاَخۡرَجۡنَا بِهٖ نَبَاتَ
كُلِّ شَىۡءٍ فَاَخۡرَجۡنَا مِنۡهُ خَضِرًا نُّخۡرِجُ مِنۡهُ حَبًّا مُّتَرَاكِبًا ۚ وَمِنَ
النَّخۡلِ مِنۡ طَلۡعِهَا قِنۡوَانٌ دَانِيَةٌ وَّجَنّٰتٍ مِّنۡ اَعۡنَابٍ وَّالزَّيۡتُوۡنَ
وَالرُّمَّانَ مُشۡتَبِهًا وَّغَيۡرَ مُتَشَابِهٍ ؕ اُنۡظُرُوۡۤا اِلٰى ثَمَرِهٖۤ اِذَاۤ اَثۡمَرَ
وَيَنۡعِهٖ ؕ اِنَّ فِىۡ ذٰ لِكُمۡ لَاٰيٰتٍ لِّقَوۡمٍ يُّؤۡمِنُوۡنَ ﴿۹۹﴾ وَجَعَلُوۡا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ
الۡجِنَّ وَخَلَقَهُمۡ وَخَرَقُوۡا لَهٗ بَنِيۡنَ وَبَنٰتٍۢ بِغَيۡرِ عِلۡمٍ ؕ سُبۡحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى
عَمَّا يَصِفُوۡنَ ﴿۱۰۰﴾

آیت ۹۵ ﴿اِنَّ اللّٰهَ فَالِقُ الۡحَبِّ وَالنَّوٰى ؕ﴾ ''یقیناً اللہ ہی دانے اور گٹھلی کو پھاڑنے والا ہے۔''

عالمِ خلق کے اندر جو اُمور اور معاملات معمول کے مطابق وقوع پذیر ہو رہے ہیں' یہاں اُن کی حقیقت بیان کی گئی ہے۔ مثلاً آم کی گٹھلی زمین میں دبائی گئی' کچھ دیر کے بعد وہ گٹھلی پھٹی اور اس میں سے دو پتے نکلے۔ اسی طرح پوری کائنات کا نظام چل رہا ہے۔ بظاہر یہ سب کچھ خود بخود ہوتا نظر آ رہا ہے' مگر حقیقت میں یہ سب کچھ اُن فطری قوانین کے تحت ہو رہا ہے جو اللہ نے اس دنیا میں فزیکل اور کیمیکل تبدیلیوں کے لیے وضع کر دیے ہیں۔ اس لیے اس کائنات میں وقوع پذیر ہونے والے ہر چھوٹے بڑے معاملے کا فاعلِ حقیقی اللہ تعالیٰ ہے۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کا ذکر شیخ عبدالقادر جیلانی ؒ نے اپنے وصایا میں کیا ہے۔ وہ اپنے بیٹے کو وصیت کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اے میرے بچے اس حقیقت کو ہر وقت مستحضر رکھنا کہ ''لا فاعلَ فی الحقیقۃ ولا مؤثِّر اِلّا اللّٰہ'' یعنی حقیقت میں فاعل اور مؤثر اللہ کے سوا کوئی نہیں۔ اشیاء میں جو تاثیر ہے وہ اُسی کی عطا کردہ ہے' اُسی کے اِذن سے ہے۔ تم کسی فعل کا ارادہ تو کر سکتے ہو لیکن فعل کا بالفعل انجام پذیر ہونا تمہارے اختیار میں نہیں ہے' کیونکہ ہر فعل اللہ کے حکم سے انجام پذیر ہوتا ہے۔

﴿يُخۡرِجُ الۡحَىَّ مِنَ الۡمَيِّتِ وَمُخۡرِجُ الۡمَيِّتِ مِنَ الۡحَىِّ ؕ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ فَاَنّٰى تُؤۡفَكُوۡنَ ﴿۹۵﴾﴾ ''وہ نکالتا ہے زندہ کو مُردہ میں سے اور وہی نکالنے والا ہے مُردہ کو زندہ میں سے' یہی تو ہے اللہ (اس کو پہچانو) لیکن تم کدھر الٹے جا رہے ہو۔''

آیت ۹۶ ﴿فَالِقُ الۡاِصۡبَاحِ ۚ﴾ ''وہی ہے صبح کو پھاڑنے والا۔''

یہ ''فلق'' کی دوسری قسم ہے کہ اللہ ہی رات کی سیاہی کا پردہ چاک کر کے سپیدۂ سحر کو نمودار کرتا ہے۔ بظاہر یہ بھی خود بخود زمین کی گردش کے تحت ہوتا نظر آتا ہے' لیکن یہ نہ سمجھیں کہ اللہ کے تصرّف اور اس کی تدبیر کے بغیر ہو رہا ہے۔ یہ سب بھی ان ہی قوانین کے تحت ہو رہا ہے جو اللہ تعالیٰ نے زمین' چاند' سورج اور دوسرے اجرامِ فلکی کے بارے میں بنا دیے ہیں۔ اس سب کچھ کا فاعلِ حقیقی بھی وہی ہے۔

﴿وَجَعَلَ الَّيۡلَ سَكَنًا وَّالشَّمۡسَ وَالۡقَمَرَ حُسۡبَانًا ؕ﴾ ''اس نے بنا دیا رات کو سکون کا وقت اور سورج اور چاند کو حساب کے لیے۔''

یہ التذکیر بآلاءِ اللہ کی مثالیں ہیں' جن کے حوالے سے اللہ کی عظمت' اس کی صفات

اوراس کی قدرت کونمایاں کیا جارہا ہے۔ یہ ایک لگا بندھا نظام ہے جس کے تحت سورج اور چاند چل رہے ہیں۔ اسی نظام سے دن اور رات بنتے ہیں اور اسی سے مہینے اور سال وجود میں آ رہے ہیں۔

﴿ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ ۝۹۶﴾ ’’یہ اندازہ مقرر کیا ہوا ہے اُس ہستی کا جو زبردست ہے اور سب کچھ جاننے والا ہے۔‘‘

آیت ۹۷ ﴿وَهُوَ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ النُّجُوْمَ لِتَهْتَدُوْا بِهَا فِيْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ۭ﴾ ’’اور وہی ہے جس نے تمہارے لیے ستارے بنائے تا کہ تم ان سے خشکی اور سمندر کی تاریکیوں میں راستہ پاؤ۔‘‘

اندھیری راتوں میں قافلے چلتے تھے تو وہ ستاروں سے سمت متعین کر کے چلتے تھے۔ اسی طرح سمندر میں جہاز رانی کے لیے بھی ستاروں کی مدد سے ہی رخ متعین کیا جاتا تھا۔

﴿قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ۝۹۷﴾ ’’ہم نے تو اپنی نشانیاں تفصیل سے بیان کر دی ہیں ان لوگوں کے لیے جو علم رکھتے ہیں۔‘‘

آیت ۹۸ ﴿وَهُوَ الَّذِيْٓ اَنْشَاَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ﴾ ’’اور وہی ہے جس نے تمہیں اٹھایا ایک جان سے‘‘

ظاہر ہے کہ تمام نوعِ انسانی ایک ہی جان سے وجود میں آئی ہے۔ اس سے حضرت آدم علیہ السلام بھی مراد ہو سکتے ہیں اور اگر نظریۂ ارتقاء میں کوئی حقیقت تسلیم کر لی جائے تو پھر تحقیق کا یہ سفر امیبا (Amoeba) تک چلا جاتا ہے کہ اس ایک جان سے مختلف ارتقائی مراحل طے کرتے ہوئے انسان بنا۔ امیبا میں کوئی sex یعنی تذکیر وتانیث کا معاملہ نہیں تھا۔ دورانِ ارتقاء رفتہ رفتہ sex ظاہر ہوا تو ﴿خَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا﴾ (النساء:۱) والا مرحلہ آیا۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر رفیع الدین مرحوم نے اپنی کتاب ’’قرآن اور علم جدید‘‘ میں بہت عمدہ تحقیق کی ہے اور مولانا امین احسن اصلاحی صاحب نے بھی اس کی تصویب کی ہے۔ جن حضرات کو دلچسپی ہو کہ ایک جان سے تمام بنی نوع انسان کو پیدا کرنے کا کیا مطلب ہے‘ وہ اس کتاب کا مطالعہ ضرور کریں۔

﴿فَمُسْتَقَرٌّ وَّمُسْتَوْدَعٌ ۭ﴾ ’’پھر تمہارے لیے ایک تو مستقل ٹھکانہ ہے اور ایک کچھ دیر (امانتاً) رکھے جانے کی جگہ۔‘‘

’’مستقر‘‘ اور ’’مستودع‘‘ کے بارے میں مفسرین کے تین اقوال ہیں:

پہلا قول یہ ہے کہ ’’مستقر‘‘ یہ دنیا ہے جہاں ہم رہ رہے ہیں اور ’’مستودع‘‘ سے مراد رحم مادر ہے۔ دوسری رائے یہ ہے کہ ’’مستقر‘‘ آخرت ہے اور ’’مستودع‘‘ قبر ہے۔ قبر میں انسان کو عارضی طور پر امانتاً رکھا جاتا ہے۔ یہ عالمِ برزخ ہے اور یہاں سے انسان نے بالآخر اپنے ’’مستقر‘‘ (آخرت) کی طرف جانا ہے۔ تیسری رائے یہ ہے کہ ’’مستقر‘‘ آخرت ہے اور ’’مستودع‘‘ دنیا ہے۔ دنیا میں جو وقت ہم گزار رہے ہیں یہ آخرت کے مقابلے میں بہت ہی عارضی ہے۔

﴿قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّفْقَهُوْنَ ۝۹۸﴾ ’’ہم نے تو اپنی آیات کو واضح کر دیا ہے ان لوگوں کے لیے جو سمجھ بوجھ سے کام لیں۔‘‘

آیت ۹۹ ﴿وَهُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَاۗءِ مَاۗءً ۚ﴾ ’’اور وہی ہے جس نے اتارا آسمان (یا بلندی) سے پانی۔‘‘

﴿فَاَخْرَجْنَا بِهٖ نَبَاتَ كُلِّ شَيْءٍ فَاَخْرَجْنَا مِنْهُ خَضِرًا نُّخْرِجُ مِنْهُ حَبًّا مُّتَرَاكِبًا ۚ﴾ ’’پھر ہم نے نکالی اس کے ذریعے سے ہر قسم کی نباتات‘ پھر ہم نے اُگائے اس سے سر سبز کھیت‘ جن میں سے ہم نکالتے ہیں دانے تہ بر تہ ایک دوسرے کے اوپر چڑھے ہوئے۔‘‘

کسی بھی فصل یا اناج کا سٹہ دیکھیں تو اس کے دانے نہایت خوبصورتی اور سلیقے سے باہم جڑے ہوئے اور ایک دوسرے کے اوپر چڑھے ہوئے نظر آتے ہیں۔

﴿وَمِنَ النَّخْلِ مِنْ طَلْعِهَا قِنْوَانٌ دَانِيَةٌ وَّجَنّٰتٍ مِّنْ اَعْنَابٍ وَّالزَّيْتُوْنَ وَالرُّمَّانَ مُشْتَبِهًا وَّغَيْرَ مُتَشَابِهٍ ۭ﴾ ’’اور کھجور کے گابھے میں سے لٹکتے ہوئے خوشے‘ اور (ہم نے بنا دیے) باغات انگوروں کے اور زیتون اور انار کے جو (رنگ‘ شکل اور ذائقے کے اعتبار سے) آپس میں مشابہ بھی ہیں اور مختلف بھی۔‘‘

﴿اُنْظُرُوْٓا اِلٰى ثَمَرِهٖٓ اِذَآ اَثْمَرَ وَيَنْعِهٖ ۭ﴾ ’’دیکھو اس کے پھل کو جب وہ پھل لاتا ہے اور دیکھو اس کے پکنے کو جب وہ پکتا ہے۔‘‘

یعنی مختلف درختوں کے پھل لانے اور پھر پھل کے پکنے کے عمل کو ذرا غور سے دیکھا

کرو۔ یہاں پر وَيَنْعِهٖ کے بعد ''اِذَا اَيْنَعَ'' (جب وہ پک جائے) محذوف مانا جائے گا۔ یعنی اس کے پکنے کو دیکھو کہ کس طرح تدریجاً پکتا ہے۔ پہلے پھل آتا ہے' پھر تدریجاً اس کے اندر تبدیلیاں آتی ہیں' جسامت میں بڑھتا ہے' پھر کچی حالت سے آہستہ آہستہ پکنا شروع ہوتا ہے۔

﴿اِنَّ فِیْ ذٰلِكُمْ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ۝۹۹﴾ ''یقیناً اس میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو ایمان رکھتے ہیں۔''

ایسی نشانیوں پر غور کرنے سے کمزور ایمان والوں کا ایمان بڑھ جائے گا' دل کے یقین میں اضافہ ہو جائے گا (بحوائے زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا) اور جن کے دلوں میں طلب ہدایت ہے انہیں ایسے مشاہدے سے ایمان کی دولت نصیب ہوگی۔

آیت ۱۰۰ ﴿وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ الْجِنَّ وَخَلَقَهُمْ﴾ ''اور انہوں نے اللہ کا شریک ٹھہرالیا جنّات کو' حالانکہ اُسی نے انہیں پیدا کیا ہے''

اللہ تعالیٰ نے جیسے انسانوں کو پیدا کیا ہے اسی طرح اس نے جنّات کو بھی پیدا کیا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ جنات کو آگ سے پیدا کیا گیا ہے اور وہ اپنی خداداد طبعی صلاحیتوں کی وجہ سے کائنات میں وسیع پیمانے پر رسائی رکھتے ہیں۔ آج انسان نے اربوں ڈالر خرچ کر کے خلاؤں کے جس سفر کو ممکن بنایا ہے' ایک عام جن کے لیے ایسا سفر معمول کی کارروائی ہو سکتی ہے' مگر ان سارے کمالات کے باوجود یہ جن ہیں تو اللہ ہی کی مخلوق۔ اسی طرح فرشتے اپنی تخلیق اور صلاحیتوں کے لحاظ سے جنات سے بھی بڑھ کر ہیں' مگر پیدا تو انہیں بھی اللہ ہی نے کیا ہے۔ لہٰذا انسان' جنات اور فرشتے سب اللہ کی مخلوق ہیں اور ان میں سے کسی کا بھی الوہیت میں ذرّہ برابر حصہ نہیں۔

﴿وَخَرَقُوْا لَهٗ بَنِيْنَ وَبَنٰتٍۭ بِغَيْرِ عِلْمٍ ؕ﴾ ''اور اس کے لیے انہوں نے گھڑ لیے ہیں بیٹے اور بیٹیاں بغیر کسی علمی سند کے۔''

حضرت عیسیٰ اور حضرت عزیر علیہما السلام کو اللہ کے بیٹے قرار دیا گیا' جب کہ فرشتوں کے بارے میں کہہ دیا گیا کہ وہ اللہ کی بیٹیاں ہیں۔

﴿سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يَصِفُوْنَ ۝۱۰۰﴾ ''وہ بہت پاک ہے اور بہت بلند و بالا ہے ان تمام چیزوں سے جو یہ بیان کر رہے ہیں۔''

آیات ۱۰۱ تا ۱۱۰

بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ اَنّٰى يَكُوْنُ لَهٗ وَلَدٌ وَّلَمْ تَكُنْ لَّهٗ صَاحِبَةٌ ؕ
وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ ۚ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۝۱۰۱ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ ۚ لَاۤ اِلٰهَ
اِلَّا هُوَ ۚ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ فَاعْبُدُوْهُ ۚ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ وَّكِيْلٌ ۝۱۰۲ لَا
تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ ؗ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ ۚ وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ ۝۱۰۳ قَدْ
جَآءَكُمْ بَصَآئِرُ مِنْ رَّبِّكُمْ ۚ فَمَنْ اَبْصَرَ فَلِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ عَمِيَ فَعَلَيْهَا ؕ
وَمَاۤ اَنَا عَلَيْكُمْ بِحَفِيْظٍ ۝۱۰۴ وَكَذٰلِكَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ وَلِيَقُوْلُوْا دَرَسْتَ
وَلِنُبَيِّنَهٗ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ۝۱۰۵ اِتَّبِعْ مَاۤ اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ۚ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا
هُوَ ۚ وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ ۝۱۰۶ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَاۤ اَشْرَكُوْا ؕ وَمَا
جَعَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا ۚ وَمَاۤ اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِوَكِيْلٍ ۝۱۰۷ وَلَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ
يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًۢا بِغَيْرِ عِلْمٍ ؕ كَذٰلِكَ زَيَّنَّا
لِكُلِّ اُمَّةٍ عَمَلَهُمْ ۪ ثُمَّ اِلٰى رَبِّهِمْ مَّرْجِعُهُمْ فَيُنَبِّئُهُمْ بِمَا كَانُوْا
يَعْمَلُوْنَ ۝۱۰۸ وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ لَئِنْ جَآءَتْهُمْ اٰيَةٌ لَّيُؤْمِنُنَّ
بِهَا ؕ قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ وَمَا يُشْعِرُكُمْ ۙ اَنَّهَاۤ اِذَا جَآءَتْ لَا
يُؤْمِنُوْنَ ۝۱۰۹ وَنُقَلِّبُ اَفْـِٕدَتَهُمْ وَاَبْصَارَهُمْ كَمَا لَمْ يُؤْمِنُوْا بِهٖۤ اَوَّلَ مَرَّةٍ
وَّنَذَرُهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ۝۱۱۰

آیت ۱۰۱ ﴿بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ﴾ ''وہ عدم سے وجود میں لانے والا ہے آسمانوں اور زمین کو۔''

یہ لفظ (بدیع) سورۃ البقرۃ کی آیت ۱۱۷ میں بھی آ چکا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا صفاتی نام ہے اور اس کے معنی ہیں عدم محض سے کسی چیز کی تخلیق کرنے والا۔

﴿اَنّٰى يَكُوْنُ لَهٗ وَلَدٌ وَّلَمْ تَكُنْ لَّهٗ صَاحِبَةٌ ؕ وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ ۚ وَهُوَ بِكُلِّ

﴿شَیۡءٍ عَلِیۡمٌ ﴿۱۰۱﴾﴾ ''اُس کے اولاد کیسے ہوسکتی ہے جبکہ اُس کی کوئی بیوی نہیں' اور اُس نے تو ہر شے کو پیدا کیا ہے' اور وہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔''

اللہ تعالیٰ کی اولاد بتانے والے یہ بھی نہیں سوچتے کہ جب اُس کی کوئی شریک حیات ہی نہیں ہے تو اولاد کیسے ہوگی؟ دراصل کائنات اور اس کے اندر ہر چیز کا تعلق اللہ کے ساتھ صرف یہ ہے کہ وہ ایک خالق ہے اور باقی سب مخلوق ہیں۔ اور وہ ایسی علیم اور خبیر ہستی ہے کہ اس کی مخلوقات میں سے کوئی شے اس کی نگاہوں سے ایک لمحے کے لیے بھی اوجھل نہیں ہو پاتی۔

آیت ۱۰۲ ﴿ذٰلِکُمُ اللّٰہُ رَبُّکُمۡ ۚ﴾ ''وہ ہے اللہ تمہارا رب''

یہ اندازِ خطاب سمجھنے کی ضرورت ہے۔ مشرکینِ مکّہ اور اہلِ عرب اللہ کے منکر نہیں تھے۔ وہ اللہ کو مانتے تو تھے لیکن اللہ کی صفات' اس کی قدرت' اس کی عظمت کے بارے میں ان کا ذہن کچھ محدود تھا۔ اس لیے یہاں یہ انداز اختیار کیا گیا ہے کہ دیکھو جس اللہ کو تم مانتے ہو وہی تو تمہارا ربّ اور پروردگار ہے۔ وہ اللہ بہت بلند شان والا ہے۔ تم نے اس کی اصل حقیقت کو نہیں پہچانا۔ تم نے اس کو کوئی ایسی شخصیت سمجھ لیا ہے جس کے اوپر کوئی دباؤ ڈال کر بھی اپنی بات منوائی جاسکتی ہے۔ تم فرشتوں کو اس کی بیٹیاں سمجھتے ہو۔ تمہارے خیال میں یہ جس کی سفارش کریں گے اُس کو بخش دیا جائے گا۔ اس طرح تم نے اللہ کو بھی اپنے اوپر ہی قیاس کرلیا ہے کہ جس طرح تم اپنی بیٹی کی بات ردّ نہیں کرتے' اسی طرح تم سمجھتے ہو کہ اللہ بھی فرشتوں کی بات نہیں ٹالے گا۔ اللہ تعالیٰ کی حقیقی قدرت' اُس کی عظمت' اُس کا وراء الوراء ہونا' اُس کا بِکُلِّ شَیۡءٍ عَلِیۡم ہونا' اُس کا عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡر ہونا' اُس کا ہر جگہ پر ہر وقت موجود ہونا اُس کی ایسی صفات ہیں جن کا تصور تم لوگ نہیں کر پا رہے ہو۔ لہٰذا اگر تم سمجھنا چاہو تو سمجھ لو: ﴿ذٰلِکُمُ اللّٰہُ رَبُّکُمۡ ۚ﴾ وہ ہے اللہ تمہارا رب جس کی یہ شان اور قدرت بیان ہو رہی ہے۔

﴿لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا ہُوَ ۚ خَالِقُ کُلِّ شَیۡءٍ فَاعۡبُدُوۡہُ ۚ وَ ہُوَ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ وَّکِیۡلٌ ﴿۱۰۲﴾﴾ ''اُس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے' وہ ہر شے کا پیدا کرنے والا ہے' پس تم اُسی کی بندگی کرو' اور وہ ہر شے کا کارساز ہے۔''

اُس کے سوا کوئی تمہارے لیے کارساز نہیں۔ خود اُس کا حکم ہے: ﴿اَلَّا تَتَّخِذُوۡا مِنۡ دُوۡنِیۡ وَکِیۡلًا ﴿۲﴾﴾ (بنی اسرائیل) کہ میرے سوا کسی اور کو اپنا کارساز نہ سمجھا کرو۔

آیت ۱۰۳ ﴿لَا تُدۡرِکُہُ الۡاَبۡصَارُ ۫ وَ ہُوَ یُدۡرِکُ الۡاَبۡصَارَ ۚ وَ ہُوَ اللَّطِیۡفُ الۡخَبِیۡرُ ﴿۱۰۳﴾﴾ ''اُسے نگاہیں نہیں پاسکتیں جبکہ وہ تمہاری نگاہوں کو پالیتا ہے' اور وہ لطیف بھی ہے اور ہر چیز سے باخبر بھی۔''

وہ اس حد تک لطیف ہے' اس قدر لطیف ہے کہ انسانی نگاہیں اس کا ادراک نہیں کر سکتیں۔ چنانچہ اس سے ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ شبِ معراج میں کیا رسول اللہ ﷺ نے اللہ کو دیکھا یا نہیں دیکھا؟ اس میں کچھ اختلاف ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی رائے یہ ہے کہ حضور ﷺ نے اللہ کو دیکھا تھا' لیکن حضرت عمر اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی رائے ہے کہ نہیں دیکھا تھا۔ اس ضمن میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا قول ہے: نُوۡرٌ اَنّٰی یُرٰی یعنی وہ تو نور ہے اسے دیکھا کیسے جائے گا؟ چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب کوہِ طور پر استدعا کی تھی: ﴿رَبِّ اَرِنِیۡۤ اَنۡظُرۡ اِلَیۡکَ ؕ﴾ (الاعراف: ۱۴۳) ''پروردگار' مجھے یارائے نظر دے کہ میں تیرا دیدار کروں!'' تو صاف کہہ دیا گیا تھا کہ ﴿لَنۡ تَرٰىنِیۡ﴾ ''تم مجھے ہرگز نہیں دیکھ سکتے''۔ اللہ اتنی لطیف ہستی ہے کہ اس کا دیکھنا ہماری نگاہوں سے ممکن نہیں۔ ہاں دل کی آنکھ سے اسے دیکھا جاسکتا ہے۔ محمدٌ رسول اللہ ﷺ دنیا میں بیٹھ کر بھی دل کی آنکھ سے اُسے دیکھ سکتے تھے۔

آیت ۱۰۴ ﴿قَدۡ جَآءَکُمۡ بَصَآئِرُ مِنۡ رَّبِّکُمۡ ۚ﴾ ''(دیکھو) تمہارے پاس آ چکی ہیں بصیرت افروز باتیں تمہارے ربّ کی طرف سے۔''

﴿فَمَنۡ اَبۡصَرَ فَلِنَفۡسِہٖ ۚ وَ مَنۡ عَمِیَ فَعَلَیۡہَا ؕ﴾ ''تو اب جو کوئی بینائی سے کام لے گا تو اپنے ہی بھلے کے لیے' اور جو کوئی اندھا بن جائے گا تو اس کا وبال اُسی پر ہوگا۔''

اب جو ان بصائر کو آنکھیں کھول کر دیکھے گا' چشم بصیرت وا کرے گا' حقائق کا مواجہہ کرے گا' حقیقت کو تسلیم کرے گا تو وہ خود اپنا ہی بھلا کرے گا اور جو ان کی طرف سے جان بوجھ کر آنکھیں بند کر لے گا' کسی تعصّب' ہٹ دھرمی اور ضد کی وجہ سے حقیقت کو نہیں دیکھنا چاہے گا تو اس کا سارا وبال اُسی پر آئے گا۔

﴿وَ مَاۤ اَنَا عَلَیۡکُمۡ بِحَفِیۡظٍ ﴿۱۰۴﴾﴾ ''اور میں تمہارے اوپر کوئی نگران نہیں ہوں۔''

یہ بات پیغمبر ﷺ کی طرف سے ادا ہو رہی ہے کہ ہر کوئی اپنے اچھے برے اعمال کا خود ذمّہ دار ہے' میری ذمّہ داری تم تک اللہ کا پیغام پہنچانا ہے' میں تمہاری طرف سے جوابدہ نہیں ہوں۔

آیت ۱۰۵ ﴿وَكَذٰلِكَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ وَلِيَقُوْلُوْا دَرَسْتَ﴾ ''اور اسی طرح ہم اپنی آیات کو گردش دلاتے ہیں تاکہ یہ پکار اُٹھیں کہ (اے نبی ﷺ) آپ نے سمجھا دیا''

ہم اپنی آیات بار بار مختلف طریقوں سے بیان کرتے ہیں' اپنی دلیلیں مختلف اسالیب سے پیش کرتے ہیں تاکہ ان پر حجت قائم ہو اور یہ تسلیم کریں کہ آپؐ نے سمجھانے کا حق ادا کر دیا ہے۔ دَرَسَ' یَدْرُسُ کے معنی ہیں لکھنا اور لکھنے کے بعد مٹانا' پھر لکھنا' پھر مٹانا۔ جیسے بچے شروع میں جب لکھنا سیکھتے ہیں تو مشق کے لیے بار بار لکھتے ہیں۔ (اس مقصد کے لیے ہمارے ہاں تختی استعمال ہوتی تھی جواب متروک ہو گئی ہے۔) یہاں تدریجاً بار بار پڑھانے کے معنی میں یہ لفظ (دَرَسْتَ) استعمال ہوا ہے۔

﴿وَلِنُبَيِّنَهٗ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ﴿۱۰۵﴾﴾ ''اور تاکہ ہم واضح کر دیں اس کو ہر طرح سے ان لوگوں کے لیے جو علم رکھتے ہیں (یا جو علم حاصل کرنا چاہتے ہیں)۔''

آیت ۱۰۶ ﴿اِتَّبِعْ مَآ اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ۚ﴾ ''آپؐ پیروی کیے جائیں اُس کی جو وحی کیا جا رہا ہے آپؐ پر آپؐ کے رب کی طرف سے۔''

اس سورۃ میں آپ دیکھ رہے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ کو بار بار مخاطب کیا جا رہا ہے۔ لیکن جیسا کہ پہلے بتایا گیا ہے یہ خطاب دراصل حضور ﷺ کی وساطت سے اُمت کے لیے بھی ہے۔ مکی سورتوں (دو تہائی قرآن) میں مسلمانوں سے براہِ راست خطاب بہت کم ملتا ہے۔ اس کی حکمت یہ ہے کہ مکی دور میں مسلمان باقاعدہ ایک اُمت نہیں تھے۔ اُمت کی تشکیل تو تحویلِ قبلہ کے بعد ہوئی۔ اسی لیے تحویل قبلہ کے حکم کے فوراً بعد یہ آیت نازل ہوئی ہے: ﴿وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ۭ﴾ (البقرۃ:۱۴۳) اب جبکہ مسلمانوں کو باقاعدہ امت کا درجہ دے دیا گیا تو پھر اُن سے خطاب بھی براہِ راست ہونے لگا۔ چنانچہ سورۃ الحجرات جو ۱۸ آیات پر مشتمل مدنی سورۃ ہے' اس میں پانچ دفعہ ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾ کے الفاظ سے اہلِ ایمان کو براہِ راست مخاطب فرمایا گیا ہے۔ لیکن دوسری طرف مکی سورتوں میں اہلِ ایمان سے جو بھی کہا گیا ہے وہ حضور ﷺ کو مخاطب کر کے واحد کے صیغے میں کہا گیا ہے۔ چنانچہ آیت زیر نظر میں یہ جو فرمایا گیا ہے کہ پیروی کرو اُس کی جو آپؐ پر وحی کیا جا رہا ہے آپؐ کے رب کی طرف سے' تو یہ حکم صرف حضور ﷺ کے لیے ہی

نہیں بلکہ تمام مسلمانوں کے لیے بھی ہے۔

﴿لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ﴿۱۰۶﴾﴾ ''اُس کے سوا کوئی معبود نہیں' اور ان مشرکوں سے کنارہ کشی کر لیجیے۔''

آیت ۱۰۷ ﴿وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَآ اَشْرَكُوْا ۭ وَمَا جَعَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا ۚ﴾ ''اور اگر اللہ چاہتا تو یہ شرک نہ کرتے۔ اور (اے نبی ﷺ) ہم نے آپؐ کو ان پر نگران نہیں بنایا ہے۔''

اگر اللہ کو اپنا جبر ہی نافذ کرنا ہوتا اور بالجبر ان سب کو ایمان پر لانا ہوتا تو اللہ کے لیے یہ کچھ مشکل نہیں تھا۔ اس سلسلے میں آپ ﷺ پر ان کی ذمہ داری ڈالی ہی نہیں گئی۔ آپؐ کو ان پر داروغہ یا نگران مقرر نہیں کیا گیا۔ آپؐ کا کام ہے حق کو واضح کر دینا۔ آپؐ اس قرآن کے ذریعے انہیں خبردار کرتے رہیے' اس کے ذریعے انہیں تذکیر کرتے رہیے' اس کے ذریعے انہیں خوشخبریاں دیتے رہیے۔ آپؐ کی بس یہ ذمہ داری ہے۔ ﴿فَذَكِّرْ ۣ اِنَّمَآ اَنْتَ مُذَكِّرٌ﴿۲۱﴾ لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ﴿۲۲﴾﴾ (الغاشیہ)۔ ''پس آپؐ انہیں یاد دہانی کرائیے' اس لیے کہ آپؐ تو یاد دہانی ہی کرانے والے ہیں۔ آپؐ ان کے اوپر نگران نہیں ہیں۔''

﴿وَمَآ اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِوَكِيْلٍ﴿۱۰۷﴾﴾ ''اور نہ ہی آپؐ ان کے ضامن ہیں۔''

آیت ۱۰۸ ﴿وَلَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًۢا بِغَيْرِ عِلْمٍ ۭ﴾ ''اور مت گالیاں دو (یا مت برا بھلا کہو) ان کو جنہیں یہ پکارتے ہیں اللہ کے سوا' تو وہ اللہ کو گالیاں دینے لگیں گے زیادتی کرتے ہوئے بغیر سوچے سمجھے۔''

یعنی کہیں جوش میں آ کر ان کے بتوں کو برا بھلا مت کہو' کیونکہ وہ ان کو اپنے معبود سمجھتے ہیں' ان کے ذہنوں میں ان کی عظمت اور دلوں میں ان کی عقیدت ہے' اس لیے کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ غصے میں آ کر جواباً اللہ کو گالیاں دینے لگ جائیں۔ لہٰذا تم کبھی ایسا اشتعال آمیز انداز اختیار نہ کرنا۔ یہاں ایک دفعہ پھر نوٹ کیجیے کہ یہ خطاب مسلمانوں سے ہے' لیکن انہیں ''يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا'' سے مخاطب نہیں کیا گیا۔

﴿كَذٰلِكَ زَيَّنَّا لِكُلِّ اُمَّةٍ عَمَلَهُمْ ۠﴾ ''اسی طرح ہم نے ہر قوم کے لیے اس کے عمل کو مزین کر دیا ہے''

جس طرح ہر کوئی اپنے عقیدے میں خوش ہے اسی طرح یہ مشرکین بھی اپنے بُتوں کی عقیدت میں مگن ہیں۔ ظاہر بات ہے وہ اُن کو اپنے معبود سمجھتے ہیں تو اُن کے بارے میں اُن کے جذبات بھی بہت حساس ہیں۔ اس لیے آپؐ انہیں مناسب انداز سے سمجھائیں' انذار' تبشیر' تذکیر اور تبلیغ وغیرہ سب طریقے آزمائیں' لیکن ان کے معبودوں کو بُرا بھلا نہ کہیں۔

﴿ثُمَّ اِلٰی رَبِّهِمْ مَّرْجِعُهُمْ فَیُنَبِّئُهُمْ بِمَا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ﴿۱۰۸﴾﴾ ''پھر اپنے ربّ ہی کی طرف ان سب کو لوٹنا ہے تو وہ ان کو جتلا دے گا جو کچھ وہ کرتے رہے تھے۔''

آیت ۱۰۹ ﴿وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَیْمَانِهِمْ لَئِنْ جَآءَتْهُمْ اٰیَةٌ لَّیُؤْمِنُنَّ بِهَا ؕ﴾ ''اور وہ اللہ کی قسمیں کھا رہے ہیں شدّومدّ کے ساتھ کہ اگر ان کے پاس کوئی نشانی آجائے تو وہ لازماً ایمان لے آئیں گے۔''

پھر ان کے اسی مطالبے کا ذکر آ گیا کہ کس طرح وہ اللہ کی قسمیں کھا کھا کر کہتے تھے کہ اگر انہیں معجزہ دکھا دیا جائے تو وہ لازماً ایمان لے آئیں گے۔ جیسا کہ پہلے بھی بتایا گیا ہے کہ یہ مضمون اس سورۂ مبارکہ کا عمود ہے۔ اِن کا یہ مطالبہ تھا کہ جب آپ (ﷺ) نبوت و رسالت کا دعویٰ کرتے ہیں تو پھر معجزہ کیوں نہیں دکھاتے؟ اس سے پہلے تمام انبیاء معجزات دکھاتے رہے ہیں۔ آپ خود کہتے ہیں کہ حضرت موسیٰؑ نے اپنی قوم کو معجزات دکھائے' حضرت عیسیٰؑ نے بھی معجزات دکھائے' حضرت صالحؑ نے اپنی قوم کو معجزہ دکھایا' تو پھر آپ معجزہ دکھا کر کیوں ہمیں مطمئن نہیں کرتے؟ اُن کے سردار اپنے عوام کو متاثر کرنے کے لیے بڑی بڑی قسمیں کھا کر کہتے تھے کہ آپ (ﷺ) دکھایئے تو سہی ایک دفعہ معجزہ' اسے دیکھتے ہی ہم لازماً ایمان لے آئیں گے۔

﴿قُلْ اِنَّمَا الْاٰیٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ﴾ ''کہہ دیجیے کہ نشانیاں تو سب اللہ کے اختیار میں ہیں''

آپ ﷺ انہیں صاف طور پر بتائیں کہ یہ میرے اختیار میں نہیں ہے۔ یہ اللہ کا فیصلہ ہے کہ وہ اس طرح کا کوئی معجزہ نہیں دکھانا چاہتا۔ ان کی اس طرح کی باتوں کا چونکہ مسلمانوں پر بھی اثر پڑنے کا امکان تھا اس لیے آگے فرمایا:

﴿وَمَا یُشْعِرُكُمْ ۙ اَنَّهَاۤ اِذَا جَآءَتْ لَا یُؤْمِنُوْنَ﴿۱۰۹﴾﴾ ''اور (اے مسلمانو!) تمہیں کیا معلوم کہ جب وہ نشانی آجائے گی تب بھی یہ ایمان نہیں لائیں گے۔''

یہ لوگ ایمان تو معجزہ دیکھ کر بھی نہیں لائیں گے' لیکن معجزہ دیکھ لینے کے بعد ان کی مہلت ختم ہو جائے گی اور وہ فوری طور پر عذاب کی گرفت میں آ جائیں گے۔ اس لیے ان کی بھلائی اسی میں ہے کہ انہیں معجزہ نہ دکھایا جائے۔ چنانچہ ان کی باتیں سن سن کر جو تنگی اور گھٹن تم لوگ اپنے دلوں میں محسوس کر رہے ہو اس کو برداشت کرو اور ان کے اس مطالبے کو نظر انداز کر دو اب جو آیت آ رہی ہے وہ بہت ہی اہم ہے۔

آیت ۱۱۰ ﴿وَنُقَلِّبُ اَفْئِدَتَهُمْ وَاَبْصَارَهُمْ كَمَا لَمْ یُؤْمِنُوْا بِهٖۤ اَوَّلَ مَرَّةٍ﴾ ''اور ہم ان کے دلوں اور ان کی نگاہوں کو اُلٹ دیں گے جس طرح وہ ایمان نہیں لائے تھے پہلی مرتبہ''

اس قاعدے اور قانون کو اچھی طرح سمجھ لیں۔ اس فلسفہ کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو جو صلاحیتیں دی ہیں اگر وہ ان کو استعمال کرتا ہے تو ان میں مزید اضافہ ہوتا ہے۔ آپ لوگوں کو علم سکھائیں گے تو آپ کے علم میں اضافہ ہو گا۔ آپ آنکھ کا استعمال کریں گے تو آنکھ صحت مند رہے گی' اس کی بصارت برقرار رہے گی۔ اگر آنکھ پر پٹی باندھ دیں گے تو دو چار مہینے کے بعد بصارت زائل ہو جائے گی۔ انسانی جوڑوں کو حرکت کرنے کے لیے بنایا گیا ہے' اگر آپ کسی جوڑ پر پلاسٹر چڑھا دیں گے تو کچھ مہینوں کے بعد اس کی حرکت ختم ہو جائے گی۔ چنانچہ جو صلاحیت اللہ نے انسان کو دی ہے اگر وہ اس کا استعمال نہیں کرے گا تو وہ صلاحیت تدریجاً زائل ہو جائے گی۔ اسی طرح حق کو پہچاننے کے لیے بھی اللہ تعالیٰ نے انسان کو باطنی طور پر صلاحیت ودیعت کی ہے۔ اب اگر ایک شخص پر حق منکشف ہوا ہے' اس کے اندر اسے پہچاننے کی صلاحیت موجود ہے' اس کے دل نے گواہی بھی دی ہے کہ یہ حق ہے' لیکن اگر کسی تعصّب کی وجہ سے' کسی ضد اور ہٹ دھرمی کے سبب اس نے اس حق کو دیکھنے' سمجھنے اور ماننے سے انکار کر دیا' تو اس کی وہ صلاحیت قدرے کم ہو جائے گی۔ اب اس کے بعد پھر دوبارہ بھی حق کی کوئی چنگاری اس کے دل میں روشن ہوئی تو اس کا اثر اس پر پہلے سے کم ہو گا اور پھر تدریجاً وہ نوبت آ جائے گی کہ حق کو پہچاننے کی وہ باطنی صلاحیت ختم ہو جائے گی۔ یہ فلسفہ سورۃ البقرۃ آیت ۷ میں اس طرح بیان ہوا ہے: ﴿خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰی سَمْعِهِمْ ؕ وَعَلٰۤی اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ ۫ وَّلَهُمْ عَذَابٌ عَظِیْمٌ﴿۷﴾﴾ ''اللہ نے مہر لگا دی ہے ان کے دلوں پر اور ان کی سماعت پر' اور ان کی آنکھوں کے آگے پردے ڈال دیے ہیں' اور ان کے لیے

بہت بڑا عذاب ہے''۔ اس لیے کہ جب ضد اور تعصّب کی بنا پر وہ لوگ سمجھتے بوجھتے حق کا مسلسل انکار کرتے رہے تو اُن کی حق کو پہچاننے کی صلاحیتیں سلب ہو گئیں۔ اب وہ اس انتہا کو پہنچ چکے ہیں جہاں سے واپسی کا کوئی امکان نہیں۔ اس کو "point of no return" کہتے ہیں۔ ہر معاملے میں واپسی کا ایک وقت ہوتا ہے' لیکن وہ وقت گزر جانے کے بعد ایسا کرنا ممکن نہیں رہتا۔

یہی فلسفہ یہاں دوسرے انداز میں پیش کیا جا رہا ہے کہ جب پہلی مرتبہ ان لوگوں پر حق منکشف ہوا' اللہ نے حجت قائم کر دی' انہوں نے حق کو پہچان لیا' ان کے دلوں' ان کی روحوں اور باطنی بصیرت نے گواہی دے دی کہ یہ حق ہے' اس کے بعد اگر وہ اس حق کو فوراً مان لیتے تو ان کے لیے بہتر ہوتا۔ لیکن چونکہ انہوں نے نہیں مانا تو اللہ نے فرمایا کہ اس کی سزا کے طور پر ہم ان کے دلوں کو اور ان کی نگاہوں کو الٹ دیں گے' اب وہ سو معجزے دیکھ کر بھی ایمان نہیں لائیں گے۔

﴿وَنَذَرُهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ﴿۱۱۰﴾﴾ ''اور ہم ان کو چھوڑ دیں گے کہ اپنی سرکشی کے اندر بھٹکتے رہیں۔''

یہی لفظ ''یَعْمَھُوْنَ'' ہم سورۃ البقرۃ کی آیت ۱۵ میں پڑھ چکے ہیں' جبکہ وہاں آیت ۱۸ میں ''عُمْیٌ'' بھی آیا ہے۔ عَمِہَ یَعْمَہُ بصیرت سے محرومی یعنی باطنی اندھے پن کے لیے آتا ہے اور ''عَمِیَ یَعْمٰی'' بصارت سے محرومی یعنی آنکھوں سے اندھا ہونے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ یہاں فرمایا کہ ہم چھوڑ دیں گے اُن کو ان کی باطنی' ذہنی' نفسیاتی اور اخلاقی گمراہیوں کے اندھیروں میں بھٹکنے کے لیے۔

آیات ۱۱۱ تا ۱۲۱

وَلَوْ اَنَّنَا نَزَّلْنَآ اِلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةَ وَكَلَّمَهُمُ الْمَوْتٰى وَحَشَرْنَا عَلَيْهِمْ كُلَّ
شَيْءٍ قُبُلًا مَّا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْٓا اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ
يَجْهَلُوْنَ ﴿۱۱۱﴾ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ
يُوْحِيْ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا ؕ وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ مَا
فَعَلُوْهُ فَذَرْهُمْ وَمَا يَفْتَرُوْنَ ﴿۱۱۲﴾ وَلِتَصْغٰٓى اِلَيْهِ اَفْـِٕدَةُ الَّذِيْنَ لَا
يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ وَلِيَرْضَوْهُ وَلِيَقْتَرِفُوْا مَا هُمْ مُّقْتَرِفُوْنَ ﴿۱۱۳﴾ اَفَغَيْرَ اللّٰهِ

اَبْتَغِيْ حَكَمًا وَّهُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ اِلَيْكُمُ الْكِتٰبَ مُفَصَّلًا ؕ وَالَّذِيْنَ
اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْلَمُوْنَ اَنَّهٗ مُنَزَّلٌ مِّنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ
الْمُمْتَرِيْنَ ﴿۱۱۴﴾ وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا ؕ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ۚ
وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۱۱۵﴾ وَاِنْ تُطِعْ اَكْثَرَ مَنْ فِي الْاَرْضِ يُضِلُّوْكَ عَنْ
سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ ﴿۱۱۶﴾ اِنَّ رَبَّكَ
هُوَ اَعْلَمُ مَنْ يَّضِلُّ عَنْ سَبِيْلِهٖ ۚ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ ﴿۱۱۷﴾ فَكُلُوْا
مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ اِنْ كُنْتُمْ بِاٰيٰتِهٖ مُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۱۸﴾ وَمَا لَكُمْ اَلَّا
تَاْكُلُوْا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ وَقَدْ فَصَّلَ لَكُمْ مَّا حَرَّمَ عَلَيْكُمْ اِلَّا مَا
اضْطُرِرْتُمْ اِلَيْهِ ؕ وَاِنَّ كَثِيْرًا لَّيُضِلُّوْنَ بِاَهْوَآئِهِمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ ؕ اِنَّ
رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِالْمُعْتَدِيْنَ ﴿۱۱۹﴾ وَذَرُوْا ظَاهِرَ الْاِثْمِ وَبَاطِنَهٗ ؕ اِنَّ
الَّذِيْنَ يَكْسِبُوْنَ الْاِثْمَ سَيُجْزَوْنَ بِمَا كَانُوْا يَقْتَرِفُوْنَ ﴿۱۲۰﴾ وَلَا تَاْكُلُوْا مِمَّا
لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ وَاِنَّهٗ لَفِسْقٌ ؕ وَاِنَّ الشَّيٰطِيْنَ لَيُوْحُوْنَ اِلٰٓى
اَوْلِيٰٓـئِهِمْ لِيُجَادِلُوْكُمْ ۚ وَاِنْ اَطَعْتُمُوْهُمْ اِنَّكُمْ لَمُشْرِكُوْنَ ﴿۱۲۱﴾

آیت ۱۱۱ ﴿وَلَوْ اَنَّنَا نَزَّلْنَآ اِلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةَ﴾ ''اور اگر ہم ان پر فرشتے اتار دیتے''

یعنی ہم ان کے مطالبے کے مطابق ایک فرشتہ تو کیا فرشتوں کی فوجیں اتار سکتے ہیں' ان فرشتوں کو آسمان سے اترتے ہوئے دکھا سکتے ہیں' لیکن اگر ہم واقعتاً فرشتے اُتار بھی دیتے اور ان کو دکھا بھی دیتے......

﴿وَكَلَّمَهُمُ الْمَوْتٰى وَحَشَرْنَا عَلَيْهِمْ كُلَّ شَيْءٍ قُبُلًا﴾ ''اور مُردے بھی ان سے گفتگو کرتے اور ہم تمام چیزیں لا کر ان کے روبرو جمع کر دیتے''

﴿مَّا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْٓا اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ﴾ ''تب بھی یہ ایمان لانے والے نہ تھے مگر یہ کہ اللہ چاہے''

اگر اللہ چاہے اور اگر کسی کے اندر حق کی طلب ہو تو اللہ تعالیٰ معجزوں کے بغیر بھی ایسے لوگوں کی آنکھیں کھول دیتا ہے۔ جو لوگ بھی محمد رسول اللہ ﷺ پر ایمان لائے تھے وہ معجزے

دیکھ کر تو نہیں لائے تھے۔ وہ طالبانِ حق تھے لہٰذا انہیں حق مل گیا۔

﴿وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ يَجْهَلُوْنَ ﴿١١١﴾﴾ ’’لیکن ان کی اکثریت جاہلوں پر مشتمل ہے۔‘‘

یہاں جاہل سے مراد جذباتی لوگ ہیں‘ جو عقل سے کام نہیں لیتے بلکہ اپنے جذبات کے آلہ کار بن جاتے ہیں۔ اگلی آیت فلسفۂ دعوت وتحریک کے اعتبار سے بہت اہم ہے۔

آیت ۱۱۲ ﴿وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ﴾ ’’اور اسی طرح ہم نے ہر نبی کے دشمن بنا دیے انسانوں اور جنوں میں سے شیاطین‘‘

سوچنے اور غور کرنے کا مقام ہے‘ انبیاء کو تو مدد کی ضرورت تھی‘ اللہ نے شیاطین کو ان کے خلاف کیوں کھڑا کر دیا؟ بہر حال یہ اللہ کا قانون ہے جو راہِ حق کے ہر مسافر کو معلوم ہونا چاہیے۔ اس میں حکمت یہ ہے کہ حق و باطل میں اس نوعیت کی کشاکش نہیں ہوگی تو پھر کھرے اور کھوٹے کی پہچان بھی نہیں ہو سکے گی۔ کیسے معلوم ہوگا کہ کون واقعی حق پرست ہے اور کون جھوٹا دعویدار۔ کون اللہ سے سچی محبت کرتا ہے اور کون دودھ پینے والا مجنوں ہے۔ یہ دنیا تو آزمائش کے لیے بنائی گئی ہے۔ یہاں اگر شر کا وجود ہی نہ ہو‘ ہر جگہ خیر ہی خیر ہو تو خیر کے طلب گاروں کی آزمائش کیسے ہوگی؟ لہٰذا فرمایا کہ یہ کشمکش کی فضا ہم خود پیدا کرتے ہیں۔ ہم خود حق پر چلنے والوں کو تلاطم خیز موجوں کے سپرد کر کے ان کی استقامت کو پرکھتے ہیں اور پھر ثابت قدم رہنے والوں کو نوازتے ہیں۔ اس میدان میں جو جتنا آزمایا جاتا ہے‘ جو جتنی استقامت دکھاتا ہے‘ جو جتنا ایثار کرتا ہے‘ اتنا ہی اُس کا مرتبہ بلند ہوتا چلا جاتا ہے۔ چنانچہ راہِ حق کے مسافروں کو مطمئن رہنا چاہیے: ؎

تندیٔ بادِ مخالف سے نہ گھبرا اے عقاب
یہ تو چلتی ہے تجھے اونچا اڑانے کے لیے!

﴿يُوْحِيْ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا ؕ﴾ ’’وہ ایک دوسرے کو اشاروں کنایوں میں پرفریب باتیں پہنچاتے رہتے ہیں گمراہ کرنے کے لیے۔‘‘

مثلاً ایک جن شیطان آکر اپنے ساتھی انسان شیطان کے دل میں خیال ڈالتا ہے کہ شاباش اپنے موقف پر ڈٹے رہو‘ اسی کا نام استقامت ہے۔ دیکھو کہیں پھسل نہ جانا اور اپنے مخالف کے موقف کو قبول نہ کر لینا۔ ان کا آپس میں اس طرح کا گٹھ جوڑ چلتا رہتا ہے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے خود اُن کو یہ چھوٹ دے رکھی ہے۔

﴿وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ مَا فَعَلُوْهُ﴾ ’’اور اگر آپ کا ربّ چاہتا تو وہ یہ نہ کر سکتے‘‘

ظاہر بات ہے کہ اس کائنات میں کوئی پتا بھی اللہ کے اِذن کے بغیر نہیں ہل سکتا۔ ابوجہل کی کیا مجال تھی کہ حضرت سمیہ رضی اللہ عنہا کو شہید کرتا۔ وہ برچھا اٹھاتا تو اُس کا ہاتھ شل ہو جاتا۔ لیکن یہ تو اللہ کی طرف سے چھوٹ تھی کہ ٹھیک ہے‘ تم ہماری اس بندی کو جتنا آزمانا چاہتے ہو آزما لو۔ ان آزمائشوں سے ہمارے ہاں اس کے مراتب بلند سے بلند تر ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ جیسا کہ سورۃ یٰسٓ میں اللہ تعالیٰ کے ایک بندے پر انعامات کا ذکر ہوا ہے:

﴿قَالَ يٰلَيْتَ قَوْمِيْ يَعْلَمُوْنَ ﴿٢٦﴾ بِمَا غَفَرَ لِيْ رَبِّيْ وَجَعَلَنِيْ مِنَ الْمُكْرَمِيْنَ ﴿٢٧﴾﴾ ’’اُس نے کہا کاش کہ میری قوم کو معلوم ہو جائے کہ کس طرح میرے ربّ نے مجھے بخش دیا اور مجھے معزّزین میں سے بنا دیا‘‘۔ اِدھر تو میری شہادت کے بعد صفِ ماتم بچھی ہوگی‘ بیوی شوہر کی جدائی میں نڈھال ہوگی‘ بچے رو رو کر ہلکان ہو رہے ہوں گے‘ لیکن کاش وہ جان سکتے کہ مجھے میرے ربّ نے کس کس طرح سے نوازا ہے‘ کیسے کیسے انعامات یہاں مجھ پر کیے گئے ہیں اور میں یہاں کس عیش و آرام میں ہوں! اگر انہیں میرے اس اعزاز و اکرام کی کچھ بھی خبر ہو جاتی تو رونے دھونے کی بجائے وہ خوشیاں منا رہے ہوتے۔

﴿فَذَرْهُمْ وَمَا يَفْتَرُوْنَ ﴿١١٢﴾﴾ ’’تو چھوڑیے آپؐ ان کو اور ان کی افترا پردازیوں کو۔‘‘

یہ ہماری سنت ہے‘ ہمارا طریقہ ہے‘ ہم نے خود ان کو یہ سب کچھ کرنے کی ڈھیل دے رکھی ہے‘ لہٰذا آپؐ ان سے اعراض فرمایئے اور ان کو ان کی افترا پردازیوں میں پڑے رہنے دیجیے۔

آیت ۱۱۳ ﴿وَلِتَصْغٰۤى اِلَيْهِ اَفْـِٕدَةُ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ﴾ ’’اور (ایسا اس لیے ہے) تاکہ مائل ہو جائیں اس کی طرف ان لوگوں کے دل جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے‘‘

﴿وَلِيَرْضَوْهُ وَلِيَقْتَرِفُوْا مَا هُمْ مُّقْتَرِفُوْنَ ﴿١١٣﴾﴾ ’’اور تاکہ وہ اس کو پسند بھی کریں اور پھر وہ اپنے برے اعمال کا جو بھی انبار جمع کرنا چاہتے ہیں جمع کر لیں۔‘‘

اس فلسفے کو ایک مثال سے سمجھئے۔ پانی کا electrolysis کریں تو negative اور positive چارج والے آئنز (ions) الگ الگ ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے دنیا میں حق و باطل کی جو کشاکش رکھی ہے‘ اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ کھرے اور کھوٹے کی ionization ہو جاتی ہے۔ اہلِ حق نکھر کر ایک طرف ہو جاتے ہیں اور اہل باطل دوسری

طرف۔ اس طرح انسانی معاشرے میں اچھے اور برے کی تمیز ہو جاتی ہے۔ جیسے کہ ہم سورۃ آلِ عمران (آیت ۱۷۹) میں پڑھ چکے ہیں ﴿حَتّٰی یَمِیْزَ الْخَبِیْثَ مِنَ الطَّیِّبِ ؕ﴾ ''تا کہ وہ ناپاک کو پاک سے الگ کر دے''۔ معاشرے کے اندر عام طور پر پاک اور ناپاک عناصر گڈمڈ ہوئے ہوتے ہیں' لیکن جب آزمائشیں اور تکلیفیں آتی ہیں' امتحانات آتے ہیں تو یہ خبیث اور طیب عناصر واضح طور پر الگ الگ ہو جاتے ہیں' منافق علیحدہ اور اہلِ ایمان علیحدہ ہو جاتے ہیں۔ آیت زیرِ نظر میں یہی فلسفہ بیان ہوا ہے کہ شیاطینِ انس وجن کو کھل کھیلنے کی مہلت اسی حکمت کے تحت فراہم کی جاتی ہے اور منکرینِ آخرت کو بھی پورا موقع دیا جاتا ہے کہ وہ اُن شیاطین کی طرف سے پھیلائے ہوئے بے سروپا نظریات کی طرف مائل ہونا چاہیں تو بے شک ہو جائیں۔

آیت ۱۱۴ ﴿اَفَغَیْرَ اللّٰهِ اَبْتَغِیْ حَكَمًا﴾ ''کیا میں اللہ کے سوا کوئی اور حکم ڈھونڈوں؟''

اب پھر یہ متجسسانہ سوال (searching question) اسی پس منظر میں کیا گیا ہے کہ مشرکین مکہ اللہ کو مانتے تھے۔ چنانچہ ان سے پوچھا جا رہا ہے کہ وہ اللہ جس کو تم مانتے ہو' میں نے بھی اُسی کو اپنا رب مانا ہے۔ تو کیا اب تم چاہتے ہو کہ میں اس معبودِ حقیقی کو چھوڑ کر کسی اور کو اپنا حکم تسلیم کرلوں' اور وہ بھی ان میں سے جن کو تم لوگوں نے اپنی طرف سے گھڑ لیا ہے' جن کے بارے میں اللہ نے کوئی سند یا دلیل نازل نہیں کی ہے۔ سورۃ الزخرف میں اسی نکتہ کو اس انداز میں پیش کیا گیا ہے: ﴿قُلْ اِنْ كَانَ لِلرَّحْمٰنِ وَلَدٌ ۖ فَاَنَا اَوَّلُ الْعٰبِدِیْنَ ﴿۸۱﴾﴾ ''آپؐ کہیے کہ اگر اللہ کا کوئی بیٹا ہوتا تو سب سے پہلے اس کو میں پوجتا''۔ یعنی جب میں اللہ کی پرستش کرتا ہوں تو اگر اللہ کا کوئی بیٹا ہوتا تو کیا میں اس کی پرستش نہ کرتا؟ چنانچہ میں جو اللہ کو اپنا معبود سمجھتا ہوں اور کسی کو اس کا بیٹا نہیں مانتا تو جان لیں کہ اس کا کوئی بیٹا ہے ہی نہیں۔ سمجھانے کا یہ انداز جو قرآن میں اختیار کیا گیا ہے بڑا فطری ہے۔ اس میں منطق کے بجائے جذبات سے براہِ راست اپیل ہے۔ دروں بینی (introspection) کی طرف دعوت ہے کہ اپنے دل میں جھانکو' گریبان میں منہ ڈالو اور سوچو' حقیقت تمہیں خود ہی نظر آ جائے گی۔

﴿وَهُوَ الَّذِیْۤ اَنْزَلَ اِلَیْكُمُ الْكِتٰبَ مُفَصَّلًا ؕ﴾ ''اور وہی تو ہے جس نے تمہاری طرف ایک بڑی مفصّل کتاب نازل کی ہے۔''

﴿وَالَّذِیْنَ اٰتَیْنٰهُمُ الْكِتٰبَ یَعْلَمُوْنَ اَنَّهٗ مُنَزَّلٌ مِّنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ

الْمُمْتَرِیْنَ ﴿۱۱۴﴾﴾ ''اور (اے نبی ﷺ) جنہیں ہم نے (پہلے) کتاب دی تھی وہ جانتے ہیں کہ یہ نازل کی گئی ہے آپؐ کے رب کی طرف سے حق کے ساتھ' تو ہرگز نہ ہو جانا شک کرنے والوں میں سے۔''

اہلِ کتاب زبان سے اقرار کریں نہ کریں' اپنے دلوں میں ضرور یقین رکھتے ہیں کہ یہ قرآن اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کردہ ہے۔

آیت ۱۱۵ ﴿وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا ؕ﴾ ''اور آپؐ کے رب کی بات تو سچائی اور عدل پر مبنی ہونے کے اعتبار سے درجہ کمال تک پہنچ چکی ہے۔''

آپ کے ربّ کی بات اُس کی مشیت کے مطابق مکمل ہو چکی ہے' جیسے سورۃ المائدہ آیت ۳ میں فرمایا: ﴿اَلْیَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِیْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْكُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا ؕ﴾

﴿لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ۚ وَهُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ﴿۱۱۵﴾﴾ ''اُس کی باتوں کو کوئی بدلنے والا نہیں' اور وہ سب کچھ سننے والا' جاننے والا ہے۔''

آیت ۱۱۶ ﴿وَاِنْ تُطِعْ اَكْثَرَ مَنْ فِی الْاَرْضِ یُضِلُّوْكَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ؕ﴾ ''اور اگر تم پیروی کرو گے زمین میں بسنے والوں کی اکثریت کی تو وہ تمہیں اللہ کے راستے سے لازماً گمراہ کر دیں گے۔''

جدید جمہوری نظام کے فلسفے کی نفی کے لیے یہ بڑی اہم آیت ہے۔ جمہوریت میں اصابت رائے کے بجائے تعداد کو دیکھا جاتا ہے۔ بقولِ اقبالؔ: ؎

جمہوریت اِک طرزِ حکومت ہے کہ جس میں
بندوں کو گنا کرتے ہیں' تولا نہیں کرتے!

اس حوالے سے قرآن کا یہ حکم بہت واضح ہے کہ اگر زمین میں بسنے والوں کی اکثریت کی بات مانو گے تو وہ تمہیں گمراہ کر دیں گے۔ دنیا میں اکثریت تو ہمیشہ باطل پرستوں کی رہی ہے۔ دورِ صحابہ میں صحابہ کرام ؓ کی تعداد دنیا کی پوری آبادی کے تناظر میں دیکھیں تو لاکھ کے مقابلے میں ایک کی نسبت بھی نہیں بنتی۔ اس لیے اکثریت کو کُلی اختیار دے کر کسی خیر کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ ہاں ایک صورت میں اکثریت کی رائے کو اہمیت دی جا سکتی ہے۔ وہ یہ کہ اگر اللہ

اوراس کے رسول ﷺ کے احکام کو قطعی اصولوں اور land makrs کے طور پر مان لیا جائے تو پھر اُن کی واضح کردہ حدود کے اندر رہتے ہوئے مباحات کے بارے میں اکثریت کی بنا پر فیصلے ہو سکتے ہیں۔ مثلاً کسی دعوت کے ضمن میں اگر یہ فیصلہ کرنا مقصود ہو کہ مہمانوں کو کون سا مشروب پیش کیا جائے تو ظاہر ہے کہ شراب کے بارے میں تو رائے شماری نہیں ہو سکتی' وہ تو اللہ اور رسول ﷺ کے حکم کے مطابق حرام ہے۔ ہاں روح افزا' کوکا کولا' سپرائٹ وغیرہ کے بارے میں آپ اکثریت کی رائے کا احترام کرتے ہوئے فیصلہ کر سکتے ہیں۔ لیکن اختیارِ مطلق (absolute authority) اور اقتدارِ اعلیٰ (sovereignty) اکثریت کے پاس ہو تو اس صورتِ حال پر اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیۡہِ رٰجِعُوۡنَ ہی پڑھا جا سکتا ہے۔ چنانچہ کلی اختیار اور اقتدارِ اعلیٰ تو بہر حال اللہ کے پاس رہے گا' جو اس کائنات اور اس میں موجود ہر چیز کا خالق اور مالک ہے۔ اکثریت کی رائے پر فیصلے صرف اُس کے احکام کی حدود کے اندر رہتے ہوئے ہی کیے جا سکتے ہیں۔

﴿اِنۡ یَّتَّبِعُوۡنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنۡ ہُمۡ اِلَّا یَخۡرُصُوۡنَ﴿۱۱۶﴾﴾ ''یہ نہیں پیروی کر رہے مگر ظن و تخمین کی اور یہ نہیں کچھ کر رہے سوائے اس کے کہ انہوں نے کچھ اندازے مقرّر کر رکھے ہیں۔''

یعنی یہ محض گمان کی پیروی کرتے ہیں اور اٹکل کے تیر تکے چلاتے ہیں' قیاس آرائیاں کرتے ہیں۔

آیت ۱۱۷ ﴿اِنَّ رَبَّکَ ہُوَ اَعۡلَمُ مَنۡ یَّضِلُّ عَنۡ سَبِیۡلِہٖ ۚ وَہُوَ اَعۡلَمُ بِالۡمُہۡتَدِیۡنَ﴿۱۱۷﴾﴾ ''یقیناً آپؐ کا ربّ خوب جانتا ہے ان کو جو اس کے راستے سے بھٹکے ہوئے ہیں' اور وہ خوب واقف ہے ان سے بھی جو ہدایت کی راہ پر ہیں۔''

آیت ۱۱۸ ﴿فَکُلُوۡا مِمَّا ذُکِرَ اسۡمُ اللّٰہِ عَلَیۡہِ اِنۡ کُنۡتُمۡ بِاٰیٰتِہٖ مُؤۡمِنِیۡنَ﴿۱۱۸﴾﴾ ''پس کھاؤ ان چیزوں میں سے جن پر اللہ کا نام لیا گیا ہے اگر تم اُس کی آیات پر ایمان رکھتے ہو۔''

یہاں کھانے پینے کی چیزوں کی حلّت و حرمت کے بارے میں مشرکینِ عرب کے جاہلانہ نظریات اور توہّمات کا رد کیا گیا ہے۔

آیت ۱۱۹ ﴿وَمَا لَکُمۡ اَلَّا تَاۡکُلُوۡا مِمَّا ذُکِرَ اسۡمُ اللّٰہِ عَلَیۡہِ﴾ ''اور تمہیں کیا ہے کہ تم

نہیں کھاتے وہ چیزیں جن پر اللہ کا نام لیا گیا ہو'

یہ بحیرہ' سائبہ' وصیلہ اور حام وغیرہ (بحوالہ المائدہ: ۱۰۳) کے بارے میں تمہارے تمام عقیدے مَن گھڑت ہیں۔ اللہ نے ایسی کوئی پابندیاں اپنے بندوں پر نہیں لگائیں۔ لہٰذا حلال جانوروں کو اللہ کا نام لے کر ذبح کیا کرو اور بلا کراہت ان کا گوشت کھایا کرو۔

﴿وَقَدۡ فَصَّلَ لَکُمۡ مَّا حَرَّمَ عَلَیۡکُمۡ﴾ ''جب کہ اللہ تفصیل بیان کر چکا ہے تمہارے لیے ان چیزوں کی جو حرام کی گئی ہیں تم پر''

یہ تفصیل سورۃ النحل کے اندر آئی ہے۔ سورۃ النحل چونکہ سورۃ الانعام سے پہلے نازل ہوئی ہے اس لیے یہاں فرمایا گیا کہ حلال چیزوں کی تفصیل تمہارے لیے پہلے ہی بیان کی جا چکی ہے۔

﴿اِلَّا مَا اضۡطُرِرۡتُمۡ اِلَیۡہِ ؕ﴾ ''سوائے اس چیز کے کہ تم مجبور ہو جاؤ اس (کے کھانے) کے لیے۔''

اس میں بھی تمہارے لیے گنجائش ہے کہ اگر اضطرار ہے' جان پر بنی ہوئی ہے' بھوک سے جان نکل رہی ہے تو ان حرام چیزوں میں سے بھی کچھ کھا کر جان بچائی جا سکتی ہے۔

﴿وَاِنَّ کَثِیۡرًا لَّیُضِلُّوۡنَ بِاَہۡوَآئِہِمۡ بِغَیۡرِ عِلۡمٍ ؕ اِنَّ رَبَّکَ ہُوَ اَعۡلَمُ بِالۡمُعۡتَدِیۡنَ﴿۱۱۹﴾﴾ ''اور یقیناً بہت سے لوگ ایسے ہیں جو بغیر علم کے اپنی خواہشات کی بنا پر لوگوں کو گمراہ کرتے پھرتے ہیں۔ یقیناً آپؐ کا ربّ خوب جانتا ہے ان حد سے تجاوز کرنے والوں کو۔''

آیت ۱۲۰ ﴿وَذَرُوۡا ظَاہِرَ الۡاِثۡمِ وَبَاطِنَہٗ ؕ﴾ ''اور چھوڑ دو (ہر طرح کے) گناہ کو' وہ کھلا ہو یا چھپا ہوا۔''

﴿اِنَّ الَّذِیۡنَ یَکۡسِبُوۡنَ الۡاِثۡمَ سَیُجۡزَوۡنَ بِمَا کَانُوۡا یَقۡتَرِفُوۡنَ﴿۱۲۰﴾﴾ ''یقیناً جو لوگ گناہ کماتے ہیں انہیں جلد ہی بدلہ ملے گا اس کا جو وہ جمع کر رہے ہیں۔''

آیت ۱۲۱ ﴿وَلَا تَاۡکُلُوۡا مِمَّا لَمۡ یُذۡکَرِ اسۡمُ اللّٰہِ عَلَیۡہِ وَاِنَّہٗ لَفِسۡقٌ ؕ﴾ ''اور مت کھاؤ اُس میں سے جس پر اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو' اور یقیناً یہ (اس کا کھانا) گناہ ہے۔''

اس آیت کا تعلق بھی مشرکینِ عرب کے خود ساختہ اعتقادات اور توہمات سے ہے۔ وہ کہتے تھے کہ بعض جانوروں کو ذبح کرتے ہوئے اللہ کا نام سرے سے لینا ہی نہیں چاہیے۔ یہ حکم

ایک خاص مسئلے کے حوالے سے ہے‘ جس کی وضاحت آگے آیت ۱۳۸ میں آئے گی۔

﴿وَاِنَّ الشَّیٰطِیۡنَ لَیُوۡحُوۡنَ اِلٰۤی اَوۡلِیٰٓئِہِمۡ لِیُجَادِلُوۡکُمۡ ۚ وَاِنۡ اَطَعۡتُمُوۡہُمۡ اِنَّکُمۡ لَمُشۡرِکُوۡنَ ﴿۱۲۱﴾﴾ ’’اور یقیناً یہ شیاطین اپنے ساتھیوں کو وحی کرتے رہتے ہیں تاکہ وہ تم سے جھگڑا کریں‘ اور اگر تم ان کا کہنا مانو گے تو تم بھی مشرک ہو جاؤ گے۔‘‘

مشرکینِ مکّہ اپنے غلط اعتقادات کی حمایت میں طرح طرح کی حجت بازی کرتے رہتے تھے‘ مثلاً یہ کیا بات ہوئی کہ جو جانور اللہ نے مارا ہے یعنی از خود مر گیا ہے وہ تو حرام قرار دے دیا جائے اور جس کو تم خود مارتے ہو یعنی ذبح کرتے ہو اس کو حلال مانا جائے؟ اسی طرح وہ سود کے بارے میں بھی دلیل دیتے تھے کہ ﴿اِنَّمَا الۡبَیۡعُ مِثۡلُ الرِّبٰوا ۘ﴾ (البقرۃ:۲۷۵) ’’کہ یہ بیع بھی تو ربا (سود) ہی کی طرح ہے‘‘۔ جیسے تجارت میں نفع ہوتا ہے ایسے ہی سودی لین دین میں بھی نفع ہوتا ہے۔ یہ کیا بات ہوئی کہ دس لاکھ کسی کو قرض دیئے اس سے چار ہزار روپے ماہانہ منافع لے لیا تو وہ ناجائز اور دس لاکھ کا مکان کسی کو کرائے پر دے کر چار ہزار روپے ماہانہ اس سے کرایہ لیا جائے تو وہ جائز! اس طرح کے اشکالات بظاہر بڑے دلنشین ہوتے ہیں‘ جن کے بارے میں یہاں بتایا جا رہا ہے کہ اس طرح کی باتیں ان کے شیاطین انہیں سکھاتے رہتے ہیں تاکہ وہ تم سے مجادلہ کریں‘ تاکہ تمہیں بھی اپنے ساتھ گمراہی کے راستے پر لے چلیں۔ لہٰذا تم ان کی اس طرح کی باتوں کو نظر انداز کرتے رہا کرو۔

☆☆☆

جہاد فی سبیل اللہ

اصل حقیقت‘ اہمیت و لزوم اور مراحل و مدارج

بانی تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد حفظہ اللہ کا ایک جامع خطاب

اشاعت خاص: 40 روپے　اشاعت عام: 15 روپے

توبہ کی عظمت اور اس کی تاثیر
اور
موجودہ حالات میں کرنے کا اصل کام

بانی تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ

زیر نظر مضمون بانی تنظیم اسلامی محترم ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ کے دو خطابات پر مشتمل ہے، جن کے مابین چھ سال کا فصل ہے۔ پہلا خطاب بعنوان ’’توبہ کی عظمت اور اس کی تاثیر‘‘ محترم ڈاکٹر صاحب نے ۴/اپریل ۲۰۰۳ء کو مسجد جامع القرآن کراچی میں ارشاد فرمایا تھا‘ جبکہ دوسرا خطاب بعنوان ’’توبہ کی اہمیت اور موجودہ حالات میں کرنے کا اصل کام‘‘ ۲۵ جنوری ۲۰۰۹ء کو بندھن شادی ہال‘ گڑھی شاہو لاہور میں ہوا تھا۔ محترم ڈاکٹر صاحب مرحوم و مغفور نے اس خواہش کا اظہار فرمایا تھا کہ ان دونوں خطابات کو یکجا کر کے کتابی شکل میں شائع کیا جائے۔ قرآن اکیڈمی لاہور کے شعبہ مطبوعات کے ادارتی معاون حافظ محمد زاہد نے دونوں خطابات کو ترتیب و تسوید کے بعد یکجا کر کے ایک مضمون کی شکل دی ہے۔ مضمون کی طوالت اور میثاق کی تنگ دامانی کے باعث صفحات ذیل میں اس مضمون کا پہلا حصہ نذر قارئین ہے۔ دوسرا حصہ‘ ان شاء اللہ‘ آئندہ شمارے میں شائع کر دیا جائے گا۔ (مدیر میثاق)

خطبۂ مسنونہ کے بعد:

اعوذ باللّٰہ من الشَّیطٰن الرَّجیم ۔ بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا تُوۡبُوۡۤا اِلَی اللّٰہِ تَوۡبَۃً نَّصُوۡحًا ؕ عَسٰی رَبُّکُمۡ اَنۡ یُّکَفِّرَ عَنۡکُمۡ سَیِّاٰتِکُمۡ وَ یُدۡخِلَکُمۡ جَنّٰتٍ تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِہَا الۡاَنۡہٰرُ ۙ یَوۡمَ لَا یُخۡزِی اللّٰہُ النَّبِیَّ وَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا مَعَہٗ ۚ نُوۡرُہُمۡ یَسۡعٰی بَیۡنَ اَیۡدِیۡہِمۡ وَ بِاَیۡمَانِہِمۡ یَقُوۡلُوۡنَ رَبَّنَاۤ اَتۡمِمۡ لَنَا نُوۡرَنَا وَ اغۡفِرۡ لَنَا ۚ اِنَّکَ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ ﴿۸﴾ (التحریم)

وَ تُوۡبُوۡۤا اِلَی اللّٰہِ جَمِیۡعًا اَیُّہَ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ لَعَلَّکُمۡ تُفۡلِحُوۡنَ ﴿۳۱﴾ (النور)

قُلۡ یٰعِبَادِیَ الَّذِیۡنَ اَسۡرَفُوۡا عَلٰۤی اَنۡفُسِہِمۡ لَا تَقۡنَطُوۡا مِنۡ رَّحۡمَۃِ اللّٰہِ ؕ اِنَّ اللّٰہَ یَغۡفِرُ الذُّنُوۡبَ جَمِیۡعًا ؕ اِنَّہٗ ہُوَ الۡغَفُوۡرُ الرَّحِیۡمُ ﴿۵۳﴾ (الزمر)

اِلَّا مَنۡ تَابَ وَ اٰمَنَ وَ عَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَاُولٰٓئِکَ یُبَدِّلُ اللّٰہُ سَیِّاٰتِہِمۡ حَسَنٰتٍ ؕ وَ کَانَ اللّٰہُ غَفُوۡرًا رَّحِیۡمًا ﴿۷۰﴾ (الفرقان)

تمہیدی کلمات

زیر گفتگو موضوع ’’توبہ کی عظمت و تاثیر اور موجودہ حالات میں کرنے کا اصل کام‘‘ قدرے طوالت طلب ہے‘ اس لیے کہ اس میں دو چیزیں جمع کر دی گئی ہیں۔ موضوع کا پہلا حصہ ’’توبہ کی عظمت و تاثیر‘‘ اپنی جگہ پر نہایت اہم اور ہمارے دین کے اساسی فکر کا بہت اہم موضوع ہے۔ میری گفتگو کا دوسرا حصہ ’’موجودہ حالات میں کرنے کا اصل کام‘‘ بذاتِ خود ایک مکمل موضوع ہے‘ بایں معنی کہ پہلے دیکھا جائے کہ موجودہ حالات کیا ہیں‘ پھر آیا اس میں اگر کوئی خرابی ہے تو اس کے اسباب کیا ہیں؟ اس کی تشخیص کیا ہے اور پھر اس کا علاج کیا ہے! ظاہر ہے کہ عنوان کے ان دونوں حصوں کا حق مجھے کسی نہ کسی درجے میں ادا کرنے کی کوشش کرنی ہے۔

میری اس گفتگو کا پس منظر یہ ہے کہ میرے گزشتہ کئی خطابات کا لُبِ لباب موجودہ عالمی حالات‘ اُمتِ مُسلمہ کو درپیش خطرات اور ان کے ضمن میں احادیثِ نبویہ ﷺ میں موجود پیشین گوئیاں تھیں۔ ان حالات و واقعات کو میں برسہا برس سے بیان کر رہا ہوں۔

احادیثِ نبویہؐ میں ان کے متعلق کافی معلومات موجود ہیں‘ چنانچہ علمی اعتبار سے یہ ایک معلوم چیز تھی‘ لیکن اب موجودہ دور میں یہ تمام حالات اور پیشین گوئیاں چشمِ سر کے سامنے درخشاں حقیقت بن کر آ رہی ہیں۔ ان موضوعات پر تو گفتگو ہوتی رہی ہے‘ لیکن ہر مرتبہ گفتگو کا اختتام اس پر ہوا کہ اس کا علاج کیا ہے؟ اس سے بچنے کا راستہ کون سا ہے؟ اور عموماً ان دونوں کا جواب ایک ہی لفظ سے دیا جاتا رہا ہے اور وہ ہے: ’’توبہ‘‘۔ پھر یہ کہ بنیادی طور پر توبہ کی دو قسمیں ہیں: انفرادی توبہ اور اجتماعی توبہ۔ انفرادی توبہ سے انسان اپنے گناہوں کی سزا سے بچ جاتا ہے اور آخرت میں اللہ تعالیٰ اُسے اپنے عفو ودرگزر‘ اپنی رحمت ومغفرت اور اپنے فضل کا مستحق قرار دیتا ہے۔ لیکن یہ بات یاد رکھیے کہ دنیا میں کسی قوم کی حالت اُس وقت تک نہیں بدلتی جب تک اجتماعی توبہ نہ ہو۔ اس اجتماعی توبہ کے ضمن میں مختصراً تو میں نے کچھ باتیں اپنے پچھلے خطابات میں عرض کی ہیں‘ لیکن اس کے بارے میں تفصیل سے گفتگو نہیں ہو سکی۔ آج میں نے طے کیا ہے کہ موجودہ حالات کے پیشِ نظر ’’توبہ‘‘ کے موضوع پر مفصل گفتگو کروں۔

اس وقت عالمِ اسلام کی صورتِ حال یہ ہے کہ اسرائیلی وزیر اعظم شیرون کہہ چکا ہے کہ عنقریب عراق پر ہمارا قبضہ ہوگا۔ اور یہ بات بھی اب واضح طور پر سامنے آ چکی ہے کہ امریکہ اور اسرائیل کے پیشِ نظر مشرقِ وسطیٰ کا پورا نقشہ بدل دینے کا پروگرام ہے۔ مشرقِ وسطیٰ کے یہ ممالک پچھلی صدی میں وجود میں آئے تھے۔ بیسویں صدی میں پہلی جنگ عظیم سے پہلے یہ پورے کا پورا علاقہ سلطنتِ عثمانیہ کے زیر نگیں تھا۔ پورا شمالی افریقہ‘ پورا مغربی ایشیا اور حجاز‘ یہ سب ایک سلطنت‘ ایک ملک اور ایک خلافت کے تحت تھا۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد اقوامِ مغرب نے اس کے حصے بخرے کیے‘ جیسے مالِ غنیمت کو فتح کے بعد بیٹھ کر تقسیم کیا جاتا ہے۔ انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ اس عالمِ عرب کے اب ٹکڑے ٹکڑے کر دیے جائیں اور انہیں باہم تقسیم کر دیا جائے۔ چنانچہ مصر اور عراق کو برطانیہ کے تحت‘ شام اور الجزائر کو فرانس کے تحت‘ لیبیا کو اٹلی‘ جبکہ باقی علاقے کو سپین کے تحت کر دیا گیا۔ تو مشرقِ وسطیٰ کے یہ پورے ممالک اُس وقت کی بندر بانٹ کے نتیجے میں وجود میں آئے تھے۔

اسی طرح اب کہا جا رہا ہے کہ موجودہ عراق جنگ کے بعد مشرقِ وسطیٰ کا نقشہ ازسرِنو تبدیل کر دیا جائے گا۔ یہ صرف حکمرانوں کی تبدیلی نہیں ہوگی بلکہ علاقے کی تبدیلی ہوگی۔ درحقیقت یہ عظیم تر اسرائیل کے قیام کا منصوبہ ہے جس پر عمل کا آغاز ہو گیا ہے۔ ورنہ اس عراق جنگ کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی‘ اس لیے کہ صدام کا کوئی جرم ثابت ہی نہیں ہوا۔ خلیج کی پہلی جنگ میں تو اس کا جرم ثابت شدہ تھا کہ اس نے کویت پر حملہ کیا تھا‘ لیکن اِس وقت تو کوئی جرم سرے سے ہے ہی نہیں۔ امریکہ کے اپنے معائنہ انسپکٹر بتاتے رہے کہ ہم نے وہاں پر کچھ نہیں دیکھا‘ کچھ نہیں پایا۔ اس حوالے سے سوچیے کہ اس جنگ کا کیا جواز ہے؟ پوری دنیا میں یہ بات تسلیم کی گئی ہے کہ یہ بلا جواز حملہ ہے۔ یہ بھی نوٹ کریں کہ کس قدر شدت‘ کتنی طاقت اور کتنی قوت سے حملہ کیا گیا ہے‘ کتنی فوجیں آئی ہیں‘ خلیج کے اندر کتنے جہاز کھڑے ہوئے ہیں جن پر سے ہوائی جہاز اڑتے ہیں۔ تو اصل میں ’’کتاب الملاحم‘‘ کے اندر حضور ﷺ کی جو پیشین گوئیاں موجود ہیں وہ اب ہمارے سامنے آ رہی ہیں۔

اسی طرح کا معاملہ اب پاکستان کا ہے۔ رفتہ رفتہ ہمارے گرد بھی گھیرا تنگ ہو رہا ہے۔ ہم پر ایک الزام یہ لگایا جا رہا ہے کہ شمالی کوریا کو ایٹمی صلاحیت پاکستان نے فراہم کی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ہمارے پاس ثبوت موجود ہیں کہ آپ نے اس کے بدلے میں ان سے میزائل ٹیکنالوجی لی ہے۔ دوسرا الزام یہ لگایا جا رہا ہے کہ ہم کشمیر میں دراندازی (infiltration) اور دہشت گردی (terrorism) کو نہیں روک سکے۔ تیسرا الزام یہ لگایا جا رہا ہے کہ یہ جو انتہا پسند اور بنیاد پرست (fundamentalists) آپ کے ملک میں سر اُٹھا رہے ہیں ان سے ہمیں اندیشہ ہے کہ آپ کی ایٹمی صلاحیت ان کے پاس نہ چلی جائے۔ اس طرح وہ القاعدہ اور دہشت گردوں تک پہنچ جائے گی۔ لہٰذا حالات بہت دگرگوں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس کا عکس ہمیں بھارت کے طرزِ عمل میں بھی نظر آ رہا ہے اور اس کا جیسا دھمکی آمیز (threatening) انداز اب ہے اس سے پہلے کبھی نہیں تھا۔ بھارت کا اب یہ موقف ہے کہ جو اصول امریکہ نے اختیار کیا ہے وہی ہمارا بھی ہے

کہ جس ملک سے ہمیں مستقبل میں کوئی اندیشہ یا خطرہ ہو اُس پر پہلے سے حملہ کرنے کا ہمیں حق حاصل ہے‘ یہ ضروری نہیں کہ اس کا کوئی جرم بھی ثابت ہو‘ چونکہ مستقبل میں ہمیں پاکستان سے اندیشہ ہے اس لیے ہمیں پاکستان پر حملہ کرنے کا حق حاصل ہے۔ بہرحال یہ چیزیں تو نوشتہ دیوار کی حیثیت سے اب ہماری نگاہوں کے سامنے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ آج توبہ کے موضوع پر کچھ عرض کروں اور اس کے ضمن میں بھی ایک خاص بات‘ جس کی طرف میرا ذہن حال ہی میں منتقل ہوا ہے‘ اضافی طور پر آپ کے سامنے رکھوں۔

توبہ کا معنی ومفہوم

سب سے پہلے یہ سمجھئے کہ توبہ کسے کہتے ہیں۔ عربی زبان میں ’’آبَ یَئُوْبُ اَوْبًا‘‘ اور ’’تَابَ یَتُوْبُ تَوْبًا‘‘ بڑے قریب کے الفاظ ہیں۔ ان کا معنی ہے: لوٹ آنا‘ پلٹ آنا۔ چنانچہ توبہ کے معنی ہوئے: پلٹ آنا —— دین کے اعتبار سے اس کا مفہوم یہ ہے کہ اگر کسی شخص نے اپنا رخ اللہ سے ہٹا کر کسی اور طرف کر دیا تھا‘ اللہ کو اپنا مقصود و مطلوب اور محبوب حقیقی بنانے کے بجائے کسی اور کو اس مقام پر رکھ دیا تھا‘ اللہ کے دین کی پابندی کے بجائے اپنے نفس یا ماحول کی پابندی کو لازم کر لیا تھا تو وہ پلٹے‘ رجوع کرے‘ لوٹے‘ اپنا رُخ اللہ کی طرف کرے۔ از روئے الفاظِ قرآنی: ﴿اِنِّیْ وَجَّھْتُ وَجْھِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا﴾ (الانعام:۷۹) ’’میں نے تو اپنا رُخ کر لیا ہے یکسو ہو کر اس ہستی کی طرف جس نے آسمان و زمین کو بنایا ہے‘‘ —— تو یہ معصیت سے اطاعت کی طرف پلٹنا‘ گناہ سے نیکی کی طرف پلٹنا‘ دنیا اور اس کی لذّتوں سے اللہ‘ اس کی مغفرت اور اس کی رحمت کی طرف پلٹنا‘ توبہ کہلاتا ہے۔

توبہ کی شرائط

یہ بھی سمجھ لیجیے کہ توبہ کی چند شرائط اور کچھ لوازم ہیں۔ اگر یہ شرائط پوری نہ ہوں تو چاہے آدمی توبہ کی تسبیح پڑھتا رہے اسے توبہ نہیں کہا جائے گا۔ یہ شرائط درج ذیل ہیں:

(۱) حقیقی پچھتاوا ہو‘ پشیمانی ہو کہ میں یہ کیا کر بیٹھا ہوں‘ یہ مجھ سے کیا ہو گیا ہے۔ یہ توبہ کی شرطِ لازم ہے۔

(۲) عزمِ مصمّم ہو کہ آئندہ یہ کام نہیں کروں گا۔ آئندہ گناہ نہ کرنے کا دل میں پختہ ارادہ باندھ لیا جائے۔

(۳) بالفعل اس بدی کو چھوڑ دیا جائے اور عملِ صالح کی روش اختیار کی جائے۔

یہ تین شرائط تو حقوق اللہ سے متعلق ہیں اور اگر معاملہ حقوق العباد کا ہو تو ان تین شرائط کے علاوہ ایک اضافی شرط یہ ہے کہ اگر کسی انسان کا حق مارا ہے تو اس کی تلافی کی جائے۔ مثلاً آپ نے کسی کو دھوکہ دے کر اس کے پیسوں پر قبضہ کر لیا ہے یا اپنی بہن کو وراثت میں سے اس کا حق نہیں دیا اور آپ اسے ہضم کر گئے ہیں یا کسی پر تہمت لگائی ہے یا کسی پر ظلم کیا ہے تو ان صورتوں میں توبہ کی ایک اضافی شرط یہ ہے کہ اس کی تلافی کی جائے اور اگر تلافی ممکن نہ ہو تو اس سے معافی حاصل کی جائے۔ اور اگر وہ شخص جس کا آپ نے حق مارا ہے فوت ہو گیا ہو تو آپ پر لازم ہے کہ جو رقم آپ کے ذمہ ہے اسے آپ اس کی طرف سے صدقہ وخیرات کر دیں۔ اگر آپ یہ کام نہیں کرتے یا اس دنیا میں ان بندوں سے جن کی حق تلفی کی گئی ہے معافی حاصل نہیں کرتے‘ تو آخرت میں نیکیوں اور گناہوں کا لین دین ہوگا۔ یعنی ظلم اور زیادتی کرنے والے شخص کی نیکیاں اُس شخص کو دے دی جائیں گی جس کے حق پر اس دنیا میں دست درازی کی گئی تھی یا جس پر ظلم کیا گیا تھا۔ اگر زیادتی کرنے والے کی نیکیوں کا سرمایہ ختم ہو جائے گا تو پھر مظلوم کے گناہ ظالم کے وزنِ اعمال کے پلڑے میں ڈال دیے جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ حقوق العباد خود سے معاف نہیں کرے گا۔ اپنے حقوق کے لیے اس کا دامن بہت کشادہ ہے‘ اپنا حق معاف کرنے کے لیے وہ ہر وقت آمادہ ہے‘ لیکن بندوں کے حقوق کے معاملے میں اللہ اپنا اختیار استعمال نہیں کرے گا۔

ایک بڑی پیاری حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک دفعہ صحابہؓ سے سوال کیا: ((اَتَدْرُوْنَ مَا الْمُفْلِسُ؟)) ’’کیا تم جانتے ہو کہ مفلس کسے کہتے ہیں؟‘‘ یہ حضور ﷺ کا ایک خاص انداز تھا کہ جب کوئی مسئلہ آپ نے سمجھانا ہوتا‘ کوئی اہم بات بتانی ہوتی تو پہلے سوال کرتے تاکہ ذہن بیدار ہو جائیں‘ اور بات سمجھ میں آ جائے۔ صحابہؓ نے کہا:

اَلْمُفْلِسُ فِیْنَا مَنْ لَا دِرْھَمَ لَہٗ وَلَا مَتَاعَ ’’ہم تو اُس کو مفلس سمجھتے ہیں جس کے پاس مال ومتاع نہ ہو‘‘۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

((اِنَّ الْمُفْلِسَ مِنْ اُمَّتِیْ یَاْتِیْ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ بِصَلَاۃٍ وَصِیَامٍ وَزَکَاۃٍ وَیَاْتِیْ قَدْ شَتَمَ ھٰذَا وَقَذَفَ ھٰذَا وَاَکَلَ مَالَ ھٰذَا وَسَفَکَ دَمَ ھٰذَا وَضَرَبَ ھٰذَا فَیُعْطٰی ھٰذَا مِنْ حَسَنَاتِہٖ وَھٰذَا مِنْ حَسَنَاتِہٖ فَاِنْ فَنِیَتْ حَسَنَاتُہٗ قَبْلَ اَنْ یُّقْضٰی مَا عَلَیْہِ اُخِذَ مِنْ خَطَایَاھُمْ فَطُرِحَتْ عَلَیْہِ ثُمَّ طُرِحَ فِی النَّارِ))(۱)

’’قیامت کے دن میری اُمّت کا مفلس وہ آدمی ہوگا کہ جو نماز‘ روزے‘ زکوٰۃ وغیرہ سب کچھ لے کر آئے گا‘ لیکن اُس نے دنیا میں کسی کو گالی دی ہوگی‘ کسی پر تہمت لگائی ہوگی‘ کسی کا مال کھایا ہوگا‘ کسی کا خون بہایا ہوگا اور کسی کو مارا ہوگا‘ تو ان سب کو اس آدمی کی نیکیاں دے دی جائیں گی اور اگر اس کی نیکیاں ان کے حقوق کی ادائیگی سے پہلے ہی ختم ہوگئیں تو ان لوگوں کے گناہ اس آدمی پر ڈال دیے جائیں گے‘ پھر اس آدمی کو جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔‘‘

یہ اہمیت ہے حقوق العباد کی۔

توبہ‘ قرآنی آیات کی روشنی میں

توبہ کے بارے میں قرآن مجید میں بے شمار آیات ہیں اور توبہ ہماری دینی تعلیمات کا اہم ستون ہے۔ میں نے ابتدا میں صرف چار آیات تلاوت کی ہیں۔

التحریم :۸: ﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا تُوْبُوْٓا اِلَی اللّٰہِ تَوْبَۃً نَّصُوْحًا﴾ ’’اے اہلِ ایمان! اللہ کی جناب میں توبہ کرو‘ خالص توبہ‘‘۔ یعنی خلوصِ دل سے توبہ کرنی ہے کہ آئندہ گناہوں سے ہر ممکن طور سے بچوں گا۔ زبانی کلامی توبہ کی تسبیح نہیں کرنی کہ توبہ بھی کرتا رہے اور گناہوں سے بچنے کی کوشش بھی نہ کرے۔ ﴿عَسٰی رَبُّکُمْ اَنْ یُّکَفِّرَ عَنْکُمْ سَیِّاٰتِکُمْ﴾ ’’امید ہے کہ تمہارا پروردگار تمہاری برائیوں کو تم سے دور کردے گا‘‘۔ یہ توبہ

(۱) صحیح مسلم‘ کتاب البر والصلۃ والآداب‘ باب تحریم الظلم۔ وسنن الترمذی‘ کتاب صفۃ القیامۃ والرقائق والورع عن رسول اللہ ﷺ باب ما جاء فی شان الحساب والقصاص۔

کی تاثیر ہے۔ اگر آپ کے اخلاق و کردار میں کوئی غلط شے شامل ہوگئی تھی تو توبہ کی بدولت اللہ تعالیٰ آپ کے کردار کے دامن کو دھو دے گا اور آپ کے نامۂ اعمال میں اگر دھبے لگے ہوئے تھے تو اللہ تعالیٰ ان دھبوں کو بھی صاف کر دے گا۔ ﴿وَیُدْخِلَکُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِھَا الْاَنْھٰرُ﴾ ’’اور تمہیں داخل کر دے گا ان باغات میں جن کے دامن میں ندیاں بہتی ہیں‘‘۔ ﴿یَوْمَ لَا یُخْزِی اللّٰہُ النَّبِیَّ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَعَہٗ﴾ ’’وہ دن جس دن اللہ تعالیٰ اپنے نبی کو رسوا نہیں کرے گا (معاذ اللہ‘ ثم معاذ اللہ) اور ان کو بھی جو اس کے ساتھ ایمان لائے‘‘۔ ﴿نُوْرُھُمْ یَسْعٰی بَیْنَ اَیْدِیْھِمْ وَبِاَیْمَانِھِمْ﴾ ’’ان کا نور ان کے سامنے اور داہنی طرف دوڑ رہا ہوگا‘‘۔ یہاں یہ بات جان لیجیے کہ انسان کے ایمان کا محل و مقام اس کا قلب ہے اور ایمان حقیقت میں ایک روشنی اور نور ہے۔ اس قلب میں جو نورِ ایمان ہے وہ میدانِ حشر میں ظاہر ہو جائے گا اور اس کی روشنی انسان کے سامنے پڑے گی۔ اس طرح انسان کے نیک اعمال میں بھی ایک نورانیت ہے۔ اس کا ظہور بھی میدانِ حشر میں ہوگا۔ چونکہ تمام نیک اعمال دائیں ہاتھ سے کیے جاتے ہیں‘ بالخصوص انفاقِ مال‘ اس لیے وہ اعمالِ صالحہ جو ہم نے اس دُنیا میں سرانجام دیے ہوں گے وہ نور کی شکل میں داہنے ہاتھ سے ظاہر ہوں گے۔ ﴿یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَتْمِمْ لَنَا نُوْرَنَا﴾ ’’(اُس وقت یہ اہلِ ایمان) کہتے ہوں گے اے اللہ! ہمارے نور کو کامل فرما دے۔‘‘

اس کا پس منظر یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ میدانِ حشر میں یہ نور ہر شخص کو اُس کے مقام و مرتبہ کے اعتبار سے ملے گا۔ ظاہر ہے ایمان کے بھی مدارج و مراتب ہیں۔ ایک ایمان حضرت ابوبکر صدیق ؓ کا ہے اور ایک ایمان عام صحابی کا ہے‘ ان کے مابین زمین و آسمان کا فرق ہے۔ اسی طرح کہاں صحابہ کرام ؓ کا ایمان اور کہاں ہم جیسے عام مسلمانوں کا ایمان۔ چہ نسبت خاک را با عالم پاک! اسی ایمان کی نسبت سے اس نور کی تابناکی اور intensity ہوگی۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ اس روز میدانِ حشر میں لوگوں کو جو نور ملے گا تو کچھ کا نور اتنا ہوگا کہ مدینے سے صنعا (یمن کے دار الحکومت) تک اس کی روشنی پہنچ رہی ہوگی جبکہ کچھ لوگوں کا نور بس اتنا ہوگا کہ صرف

ان کے قدموں کے آگے روشنی ہو جائے۔ جن کو اُس روز اتنا نور بھی مل جائے وہ بھی بڑے نصیب والے اور کامیاب وکامران لوگ شمار ہوں گے' کیونکہ وہ اس کٹھن اور سخت مرحلے سے گزر جائیں گے جس کے آگے ان کی منزلِ مراد یعنی جنت ہے۔ کم نور والوں کے نور کی حیثیت ٹارچ کی روشنی کی سی ہوگی اور اُس دن اتنی روشنی کی بھی بڑی اہمیت ہو گی۔ آپ جانتے ہیں کہ اگر آپ کو اندھیری شب میں جنگل سے گزرنا ہو تو آپ کے لیے ایک ٹارچ بھی کس قدر بڑی نعمت ہے کہ آدمی دیکھ لیتا ہے کہ سامنے کیا ہے۔ کہیں سامنے کوئی سانپ' کوئی گڑھا یا کھائی تو نہیں؟ تو اس وقت جن کو وہ ٹارچ نصیب ہو گئی وہ بھی بہت خوش قسمت ہوں گے' لیکن اُن کی کیا شان ہے جن کا نور مدینے سے صنعا تک پہنچ رہا ہوگا — اب جن کے نور کی تابانی کم ہوگی وہ اللہ سے دعا کرتے ہوں گے: ﴿رَبَّنَآ اَتۡمِمۡ لَنَا نُوۡرَنَا﴾ کہ اے پروردگار! ہمارے نور کو بھی کامل کر دے جیسا تو نے اپنے ان بندوں پر کتنا فضل کیا ہے اور کتنا بڑا نور ان کو عطا کیا ہے۔ یہ نور تب کامل ہوگا جب انسان توبہ کرے گا اور اس کے گناہ بخش دیے جائیں گے۔ چنانچہ اہلِ ایمان اتمامِ نور کی دعا کے ساتھ ساتھ یہ بھی دعا کر رہے ہوں گے: ﴿وَاغۡفِرۡ لَنَا﴾ ''اور ہمارے گناہوں کی پردہ پوشی کر دے''۔ ظاہر بات ہے کہ گناہوں کی پردہ پوشی ہوگی تو پھر اس نور کی تابناکی میں اضافہ ہوگا۔ ﴿اِنَّکَ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ ﴿۸﴾﴾ ''یقیناً تو ہر شے پر قادر ہے۔''

النور:۳۱: ﴿وَتُوۡبُوۡۤا اِلَی اللّٰہِ جَمِیۡعًا اَیُّہَ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ لَعَلَّکُمۡ تُفۡلِحُوۡنَ ﴿۳۱﴾﴾

''اے ایمان والو! اللہ کی جناب میں سب مل جل کر توبہ کرو تاکہ تم فلاح پاؤ۔''

سورۃ النور کی آیت ۳۱ ایک طویل آیت ہے' جس کا یہ آخری ٹکڑا ہے۔ خطاب کے آغاز میں توبہ کے متعلق دو اصطلاحات بیان کی گئی تھیں' انفرادی توبہ اور اجتماعی توبہ۔ سورۃ التحریم کی متذکرہ بالا آیت کا تعلق انفرادی توبہ سے ہے جبکہ سورۃ النور کی اس آیت کا تعلق اجتماعی توبہ سے ہے۔ اس آیت میں اہل ایمان کو خطاب کر کے کہا جا رہا ہے کہ سب مل کر گناہوں سے توبہ کرلو تو تمہارے حالات بدل جائیں گے اور تم دنیا و آخرت دونوں میں فلاح یاب ہو جاؤ گے۔

الزمر:۵۳: ﴿قُلۡ یٰعِبَادِیَ الَّذِیۡنَ اَسۡرَفُوۡا عَلٰۤی اَنۡفُسِہِمۡ لَا تَقۡنَطُوۡا مِنۡ رَّحۡمَۃِ اللّٰہِ ؕ اِنَّ اللّٰہَ یَغۡفِرُ الذُّنُوۡبَ جَمِیۡعًا ؕ﴾

توبہ کے موضوع پر یہ قرآن حکیم کی عظیم ترین آیت ہے۔ گناہوں کی کثرت کی وجہ سے بعض لوگوں پر کچھ مایوسی طاری ہو جاتی ہے کہ ہم اتنے عرصے سے گناہ کرتے چلے آ رہے ہیں' ہمیں کیسے معافی ملے گی' کیسے ممکن ہے کہ ہمیں چھٹکارا مل جائے؟ ایسے لوگوں کے اطمینان کے لیے' ان کی دلجوئی اور ان کی تسلی کے لیے یہ عظیم ترین آیت نازل ہوئی ہے۔ یہ آیت مغفرت کے ضمن میں قرآن مجید کی سب سے زیادہ امید افزا آیت ہے۔ فرمایا: ﴿قُلۡ یٰعِبَادِیَ الَّذِیۡنَ اَسۡرَفُوۡا عَلٰۤی اَنۡفُسِہِمۡ﴾ ''(اے نبی ﷺ) کہہ دیجیے: اے میرے وہ بندو جنہوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا ہے''۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اگر تم گناہ کرتے ہو تو اس سے میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے' بلکہ خود اپنی جانوں پر ظلم کرتے ہوئے اپنے ساتھ زیادتی کرتے ہو۔ ظاہر بات ہے کہ اللہ تو غنی ہے' کسی کے گناہ سے اس کی سلطنت میں تو کوئی کمی نہیں آتی۔ ایک حدیث قدسی کا مفہوم یہ ہے کہ اے میرے بندو! اگر تم تمام اولین و آخرین اور تمام جن و انس سب کے سب دنیا کے بدترین فاسق و فاجر انسان جیسے ہو جاؤ تب بھی میری سلطنت میں کوئی کمی نہیں آئے گی اور اگر تم سب کے سب اوّلین و آخرین اور جن و انس متقی ترین انسان جیسے بن جاؤ تب بھی میری سلطنت میں کوئی اضافہ نہیں ہوگا۔ اس سے معلوم ہوا کہ انسان گناہ کر کے صرف اپنا نقصان کرتا ہے' اس سے اللہ تعالیٰ کا تو کچھ نہیں بگڑتا ہے۔ اس لیے فرمایا: ﴿قُلۡ یٰعِبَادِیَ الَّذِیۡنَ اَسۡرَفُوۡا عَلٰۤی اَنۡفُسِہِمۡ﴾ ''(اے نبی ﷺ) کہہ دیجیے: اے میرے وہ بندو جنہوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا ہے''۔ ﴿لَا تَقۡنَطُوۡا مِنۡ رَّحۡمَۃِ اللّٰہِ ؕ﴾ ''اللہ کی رحمت سے مایوس مت ہو''۔ ﴿اِنَّ اللّٰہَ یَغۡفِرُ الذُّنُوۡبَ جَمِیۡعًا ؕ﴾ ''بے شک اللہ تمام گناہوں کو بخشنے کا اختیار رکھتا ہے''۔ اللہ تعالیٰ کی قدرت ہے' اللہ کا اختیار ہے کہ وہ چاہے تو تمام کے تمام گناہ ایک پل میں معاف کر دے' اس لیے کسی کو مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ ﴿اِنَّہٗ ہُوَ الۡغَفُوۡرُ الرَّحِیۡمُ ﴿۵۳﴾﴾ ''بے شک وہ تو بخشنے والا اور رحم فرمانے والا۔''

الفرقان: ۷۰ : سورۃ الفرقان کے آخری رکوع میں شرک' قتلِ ناحق اور زنا جیسے اکبر الکبائر گناہوں کا تذکرہ کرنے کے بعد فرمایا: ﴿اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا﴾ ''سوائے اُس کے جو تائب ہوا اور ایمان لایا اور اچھے عمل کیے''۔ یہاں ایمان لانے سے مراد یہ ہے کہ ایمان کی تجدید کرے۔ جب گناہ کا ارتکاب کیا تھا تو اس کا ایمان اس کے دل سے نکل گیا تھا یا زائل ہو گیا تھا یا کمزور ہو گیا تھا' ورنہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ دل میں قوی ایمان موجود ہو اور پھر گناہ ہو جائے۔ اسی لیے نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ((لَا یَزْنِی الزَّانِیْ حِیْنَ یَزْنِیْ وَھُوَ مُؤْمِنٌ)) ''کوئی زانی حالت ایمان میں زنا نہیں کرتا (یہ کیسے ممکن ہے کہ دل میں ایمان موجود ہو اور زنا ہو جائے)''۔ ((وَلَا یَسْرِقُ السَّارِقُ حِیْنَ یَسْرِقُ وَھُوَ مُؤْمِنٌ)) ''اور کوئی چور حالت ایمان میں چوری نہیں کرتا''۔ ((وَلَا یَشْرَبُ الْخَمْرَ حِیْنَ یَشْرَبُھَا وَھُوَ مُؤْمِنٌ)) (۱) ''اور کوئی شخص جب شراب پیتا ہے تو حالتِ ایمان میں شراب نہیں پیتا''——یعنی گناہ کرتے وقت انسان کے دل سے ایمان نکل جاتا ہے اور پھر جب وہ توبہ کرتا ہے تو ایمان واپس آ جاتا ہے۔ اسی لیے فرمایا: ﴿اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا﴾ ''سوائے اس کے جس نے توبہ کی اور اپنے ایمان کی تجدید کی اور پھر عملِ صالح کی روش اختیار کی''۔ ﴿فَاُولٰٓئِکَ یُبَدِّلُ اللّٰہُ سَیِّاٰتِھِمْ حَسَنٰتٍ ط﴾ ''(تو یہ وہ لوگ ہیں کہ) اللہ ان کی برائیوں کو نیکیوں سے بدل دے گا''۔ یعنی ان کے نامۂ اعمال سے بدیوں کے دھبے صاف ہو جائیں گے اور وہاں نیکیوں کا اندراج ہو جائے گا۔ ﴿وَکَانَ اللّٰہُ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا ۷۰﴾ ''اور اللہ تو ہے ہی بخشنے والا' رحم کرنے والا''

توبہ کا فلسفہ اور اس کی حقیقت

توبہ کے متعلق احادیث کے مطالعہ سے پہلے توبہ کا فلسفہ سمجھ لیجیے۔ دیکھئے ایک ہے طبعی (physical) اعمال اور ان کے طبعی اثرات کا معاملہ کہ دُنیا میں ان طبعی اعمال کا

(۱) صحیح البخاری' کتاب المظالم' باب النھبی بغیر اذن صاحبہ۔ وصحیح مسلم' کتاب الایمان' باب بیان نقصان الایمان بالمعاصی......

اصول یہ ہے کہ ان کے نتائج اور اثرات لازمی ہیں اور ان سے چھٹکارا ممکن نہیں۔ مثلاً آپ نے خودکشی کا ارادہ کیا اور سنکھیا کھا لیا۔ اب چاہے آپ پر ندامت ہو' پشیمانی ہو' پریشانی ہو' توبہ کریں' لیکن اب بچنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا' زہر نے تو اپنا کام دکھانا ہے۔ اِلاّ یہ کہ اللہ تعالیٰ اپنی معجزانہ قدرت سے اس عمل کے طبعی نتیجے کو تبدیل کر دے یا فی الوقت اس کے نتیجے کو روک دے۔ اس کی مثال بھی موجود ہے' مثلاً آگ کی فطرت ہے جلانا' مگر اللہ کے حکم سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اس نے نہیں جلایا: ﴿قُلْنَا یٰنَارُ کُوْنِیْ بَرْدًا وَّسَلٰمًا عَلٰٓی اِبْرٰھِیْمَ ۶۹﴾ (الانبیاء) ''ہم نے کہا: اے آگ ٹھنڈی اور سلامتی والی ہو جا ابراہیم پر''۔ لیکن یہ واضح رہے کہ ان طبعی اعمال کے نتائج کا تبدیل ہونا روز روز نہیں ہوتا' کیونکہ اگر ایسا روز روز ہو تو کوئی سائنس اور کوئی ٹیکنالوجی ممکن ہی نہ ہو۔ یہ تو طبیعیاتی اور کیمیائی قوانین کا دوام ہے جس کی وجہ سے یہ ساری سائنس اور ٹیکنالوجی ترقی کی منزلیں طے کر کے اب کہاں سے کہاں پہنچ رہی ہے کہ ؎

عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں
کہ یہ ٹوٹا ہوا تارا مہِ کامل نہ بن جائے!

توبہ کے بارے میں یہ اصول جان لیں کہ یہ طبعی اعمال میں مفید نہیں ہے۔ چاہے آپ یہ احساس کریں کہ میں کیا کر بیٹھا ہوں یا آپ اپنے کیے پر شرمندہ ہوں یا پچھتائیں' تب بھی طبعی اعمال کے نتائج توبہ سے تبدیل نہیں ہو سکتے۔ البتہ اخلاقی اعمال کا معاملہ یہ نہیں ہے۔ اخلاقی اعمال کے نتائج توبہ کے ساتھ ختم ہو جاتے ہیں۔ یہ ایک بہت بڑا قانون ہے اور اللہ تعالیٰ کی رحمتِ کاملہ کا مظہر ہے۔ اگر کسی گناہ کا ارتکاب ہوا ہے' کوئی خطا سرزد ہوئی ہے تو لازم نہیں ہے کہ اس کا اثر ضرور ظاہر ہو' بلکہ اس سے بچاؤ کا ایک راستہ ہے اور وہ درحقیقت ''توبہ'' کا راستہ ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ کسی گناہ سے انسان کی فطرت میں کوئی ایسی مستقل کجی واقع ہو جائے کہ جس کی اصلاح کی کوئی صورت ہی نہ ہو۔ انسان سے بڑے سے بڑا گناہ بھی سرزد ہو جائے اور پھر وہ خلوص اور سچے دل کے ساتھ توبہ کر لے اور اس کے اصول' قواعد و ضوابط اور اس کی شرائط کو پورا کرے تو وہ گناہ

مٹ جائے گا۔ آج ہم اس موضوع پر ایسی چشم کشا احادیث نبویہؐ کا مطالعہ کریں گے کہ آپ حیران رہ جائیں گے۔ عام طور پر خطاب و وعظ میں چونکہ لوگوں کو اصلاح کی ترغیب دلانی ہوتی ہے اس لیے انذار کے پہلو کو زیادہ نمایاں کیا جاتا ہے اور اللہ کی صفت ﴿وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ ذُو انْتِقَامٍ ﴿٤﴾﴾ (آل عمران) ’’اور اللہ زورآور' سخت انتقام لینے والا ہے‘‘ کا حوالہ دیا جاتا ہے تاکہ لوگ راہِ راست پر آ جائیں۔ لیکن یہ دوسرا پہلو بھی اپنی جگہ بہت اہمیت کا حامل ہے کہ طبعی اعمال کے نتائج وعواقب اور اخلاقی اعمال کے نتائج وعواقب ایک جیسے نہیں ہوتے۔ طبعی اعمال کے نتائج تبدیل نہیں ہو سکتے جبکہ اخلاقی اعمال کے نتائج توبہ سے تبدیل اور ختم ہو سکتے ہیں۔

مذاہب عالم کی ایک بڑی غلطی

توبہ کے معاملے میں تاریخ مذاہبِ عالم میں ایک بہت بڑی غلطی ہوئی ہے اور دُنیا کے دوسرے مذاہب نے اپنے فلسفہ اخلاق میں توبہ کے بارے میں بہت ٹھوکریں کھائی ہیں جس کے باعث ان کا نقطہ نظر کج ہو گیا ہے۔ اب دیکھئے اصل تورات میں حضرت آدم وحوا علیہما السلام سے سرزد ہونے والی غلطی' ان کی توبہ اور پھر اس غلطی کے معاف ہونے کا تذکرہ موجود تھا' لیکن بعد میں جب تورات کو دوبارہ مرتّب کیا گیا تو اس میں ان کی توبہ اور معافی کا ذکر شامل نہیں کیا گیا۔ اس کی وجہ سے انہوں نے عجیب وغریب فلسفے بنا لیے —— آپ اندازہ کیجیے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو کتنا اونچا مقام عطا کیا تھا کہ سارے فرشتوں کو ان کے سامنے سجدہ کروایا اور اس کے بعد صرف ایک ہی حکم دیا کہ اس درخت کے قریب مت جانا! اُس وقت تو ابھی کوئی شریعت نہیں تھی اور نہ ہی کوئی لمبے چوڑے احکام تھے۔ بس صرف یہ حکم دیا گیا تھا کہ جہاں سے مرضی کھاؤ پیو' سارا باغ مباح ہے' بس اس ایک درخت کے قریب مت جانا۔ از روئے الفاظِ قرآنی: ﴿وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿٣٥﴾﴾ (البقرۃ) ’’اور اس درخت کے قریب مت جانا ورنہ تم ظالموں میں سے ہو جاؤ گے‘‘۔ مگر حضرت آدم اور حضرت حوا علیہما السلام وہی کام کر بیٹھے جس سے منع کیا گیا تھا۔ سوچیے' کتنی بڑی خطا ہو گئی! لیکن قرآن نے وضاحت کر دی کہ

اس غلطی کے سرزد ہونے کے فوراً بعد حضرت آدم کے دل میں ندامت پیدا ہو گئی۔ دل میں پچھتاوا ہے اور دل توبہ کر چکا ہے لیکن ان کے پاس الفاظ نہیں تھے کہ میں کن الفاظ میں اللہ سے معافی مانگوں۔ تو وہ الفاظ بھی اللہ نے سکھائے: ﴿فَتَلَقّٰۤى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ ؕ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿٣٧﴾﴾ (البقرۃ) ’’پھر سیکھ لیے آدم نے اپنے ربّ سے چند کلمات' تو اللہ نے اس کی توبہ قبول کر لی۔ بے شک وہی تو ہے توبہ کا بہت قبول کرنے والا اور رحم فرمانے والا‘‘

توبہ کی اصل حقیقت تو انسان کے اندر اپنی غلطی پر ندامت کا پیدا ہو جانا ہے۔ اس حقیقت کو علامہ اقبال نے اپنے عنفوانِ شباب میں اس شعر میں نہایت خوبصورتی سے بیان کیا ہے' جسے داغ دہلوی نے بہت پسند کیا اور اس پر داد دی کہ میاں اس عمر میں یہ شعر!

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چُن لیے
قطرے جو تھے میرے عرقِ انفعال کے!

انفعال کہتے ہیں پشیمانی اور شرمندگی کو۔ عام طور پر جب کسی انسان پر پشیمانی اور شرمندگی طاری ہوتی ہے تو پیشانی پر پسینہ سا آ جاتا ہے۔ اس بارے میں علامہ اقبال کہتے ہیں کہ اللہ کی نگاہ میں ان قطروں کی اتنی قیمت اور اتنی وقعت ہے' کہ میرے بندے نے پشیمانی اختیار کی ہے' اسے اپنے اس غلط کام پر رنج وافسوس ہو رہا ہے' کہ پروردگار نے پسینے کے ان قطروں کو موتیوں کی طرح چن لیا ہے۔ حضرت آدمؑ سے جب خطا کا ارتکاب ہوا تو ان کے دل میں وہ پشیمانی پیدا ہو گئی' لیکن ان کے پاس وہ الفاظ نہیں تھے جن سے اپنی پشیمانی کا اظہار کرتے۔ تو اللہ تعالیٰ کی رحمت یہ ہوئی کہ اُس نے وہ کلمات خود سکھا دیے۔ قرآن نے ان ’’کلمات‘‘ کا بھی تذکرہ کیا ہے جن کے سبب حضرت آدم وحوا کو معافی ملی: ﴿رَبَّنَا ظَلَمْنَاۤ اَنْفُسَنَا ٚ وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿٢٣﴾﴾ (الاعراف) ’’اے ہمارے رب! ہم نے اپنی جانوں پر ظلم کیا ہے' اور اگر تو نے ہمیں بخش نہ دیا اور ہم پر رحم نہ فرمایا تو ہم ضرور خسارہ پانے والوں میں ہو جائیں گے‘‘۔ یہ بعینہٖ وہی بات ہے جو سورۃ الزمر کی آیت ۵۳ میں بیان ہوئی ہے: ﴿يٰعِبَادِيَ

﴿الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ﴾ یعنی گناہ کرنے والا خود اپنے آپ پر ظلم کرتا ہے‘ اس سے اللہ کو کوئی نقصان نہیں ہوتا۔ یہاں بھی حضرت آدم نے یہی دعا کی کہ اے ہمارے ربّ! ہم نے یہ گناہ کر کے اپنی جانوں پر ظلم کیا ہے اور اگر تو نے ہمیں معاف نہ کیا تو ہم نقصان اٹھانے والوں میں سے ہو جائیں گے۔

جیسا کہ عرض کیا گیا‘ اصل تورات میں تو حضرت آدم وحوا علیہما السلام کی توبہ اور ان کی معافی کا تذکرہ موجود تھا‘ لیکن موجودہ تورات‘ جو بعد میں مرتب ہوئی‘ اس میں حضرت آدم وحوا کی معافی والی بات شامل نہیں ہے۔ اصل حقیقت کو جاننے کے لیے ہم مختصراً تورات کی تاریخ پر نظر ڈالتے ہیں۔ اصل تورات ۲۶ سو برس سے دنیا سے غائب ہے۔ تورات کا اصل نسخہ یروشلم میں موجود ہیکل سلیمانی (حضرت سلیمان علیہ السلام کی بنائی ہوئی مسجد) میں موجود تھا۔ ۵۸۷ قبل مسیح میں بابل کے بادشاہ بخت نصر (Nebuchadnezzar) نے اس ہیکل سلیمانی کو گرا دیا تو وہ نسخہ اسی ملبے میں دفن ہو گیا۔ یہودیوں کا دعویٰ ہے کہ وہ نسخہ مسجد اقصیٰ کے نیچے اب بھی موجود ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ جب بخت نصر نے ہیکل سلیمانی کو گرایا تھا تو جو نیچے تہ خانے تھے وہ نہیں گرے تھے اور محفوظ رہ گئے تھے اور وہاں تورات کا اصل نسخہ اور تابوتِ سکینہ (جس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا عصا‘ مَن وسلویٰ کے نمونے اور بہت سے تبرکات رکھے ہوئے ہیں) موجود ہے۔ انہی تہ خانوں میں ہیکل کے ربائیوں کی لاشیں بھی موجود ہیں۔ جب ہم کھدائی کریں گے تو یہ تمام چیزیں دنیا کے سامنے آ جائیں گی۔ بہرحال اِس وقت مجھے یہ کہنا ہے کہ چونکہ اصل تورات اس وقت گم ہو گئی تھی اور ڈیڑھ سو سال کے بعد اسے یادداشتوں سے مرتب کیا گیا تو اس میں غلطیاں پیدا ہو گئیں اور ایک بڑی غلطی یہ ہوئی کہ حضرت آدم علیہ السلام نے جو توبہ کی اور اللہ نے ان کی توبہ کو قبول فرما لیا‘ اس کا ذکر اس موجودہ تورات میں نہیں ہے۔ اس سے عیسائیوں نے یہ نتیجہ اخذ کیا اور عقیدہ بنا لیا کہ وہ ابتدائی گناہ (original sin) جو ہمارے جدّامجد آدمؑ سے سرزد ہوا تھا اس گناہ کا اثر نسل آدم میں پیدا ہونے والے ہر بچے میں ہوتا ہے۔ چنانچہ ہر بچہ پیدائشی طور پر گناہ گار ہے اور وہ اپنے جدامجد کے گناہ کی گٹھڑی لے کر

اس دنیا میں آنکھیں کھولتا ہے۔ عیسائیوں کے اس عقیدے اور اسلام کی تعلیمات میں زمین وآسمان کا فرق ہے۔ اسلام کے مطابق ہر بچہ جو پیدا ہوتا ہے وہ معصوم ہے‘ بلکہ مسلم ہے۔ حضور ﷺ کا فرمان ہے:

((مَا مِنْ مَوْلُوْدٍ اِلَّا یُوْلَدُ عَلَی الْفِطْرَۃِ‘ فَاَبَوَاہُ یُھَوِّدَانِہٖ اَوْ یُنَصِّرَانِہٖ اَوْ یُمَجِّسَانِہٖ)) (۱)

’’ہر بچہ فطرتِ اسلام پر پیدا ہوتا ہے‘ یہ تو اُس کے والدین ہیں جو اس کو عیسائی یا یہودی یا مجوسی بنا لیتے ہیں۔‘‘

جب عیسائیوں نے یہ غلط عقیدہ اختیار کیا کہ بنی نوع انسان کا ہر بچہ بنیادی طور پر گناہ گار ہے اور وہ اپنے جدامجد کے گناہ کا بوجھ لے کر اس دنیا میں آ رہا ہے تو اب انہوں نے اس کے علاج کے طور پر ’’کفارہ‘‘ کا عقیدہ ایجاد کیا۔ یہ ہے ایک غلطی پر دوسری غلطی اور دوسری پر تیسری غلطی ؎

خشتِ اوّل چوں نہد معمار کج
تا ثریا می رود دیوار کج

عیسائیوں کے نزدیک عقیدۂ ’’کفارہ‘‘ کی تفصیل یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے دیکھا کہ آدم کی اولاد کا ہر بچہ بنیادی اور پیدائشی طور پر گناہ گار ہے تو اللہ نے اپنے اکلوتے صلبی بیٹے ’’مسیح‘‘ کو زمین پر بھیجا اور اسے آدم کے گناہ کے کفارہ کی غرض سے سولی پر چڑھا دیا (معاذ اللہ‘ نقلِ کفر کفر نہ باشد)۔ اسے گویا قربانی کا بکرا بنا دیا اور ان سب گناہ گاروں کی طرف سے قبول کر لیا تاکہ جو عیسیٰ کو مانتے ہیں ان کے گناہ کا کفارہ ہو جائے۔

یہ عقیدہ ہے عیسائیت کا۔ اس عقیدہ کی بنیاد اور جڑ یہی ہے کہ جب گناہ ہو گیا تو گناہ کا اثر باقی رہے گا۔ جبکہ قرآن یہ کہتا ہے کہ نہیں‘ تمہاری سیرت وکردار پر جو بھی داغ ہیں‘ دھل جائیں گے اور تمہارے نامۂ اعمال میں جو دھبے ہیں‘ صاف ہو جائیں گے‘ بس خلوصِ دل سے توبہ کر لو: ﴿تُوْبُوْٓا اِلَی اللّٰہِ تَوْبَۃً نَّصُوْحًا ؕ عَسٰی رَبُّکُمْ اَنْ یُّکَفِّرَ

(۱) صحیح البخاری‘ کتاب الجنائز‘ باب اذا اسلم الصبی فمات ھل یصلی علیه وھل یعرض علی الصبی۔ وصحیح مسلم‘ کتاب القدر‘ باب معنی کل مولود یولد علی الفطرة ......

عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ﴾۔

توبہ کے اس فلسفے کا ایک اور نتیجہ نکلتا ہے کہ اگر آپ سے کوئی خطا ہوگئی‘ گناہ ہوگیا اور آپ کو یہ بتایا جائے کہ اب بچاؤ کی کوئی شکل نہیں ہے‘ اس کی سزا تو مل کر رہے گی‘ تو ظاہر ہے کہ پھر آپ کے اندر اصلاح کا کوئی جذبہ پیدا ہی نہیں ہوگا۔ اصلاح کے لیے ایک قوتِ ارادی کی ضرورت ہوتی ہے اور بچاؤ کا ہر دروازہ بند کرنے سے قوتِ ارادی کا پیدا ہونا ناممکن ہے۔ اسلام نے اس اصلاح کے جذبے اور قوتِ ارادی کو زندہ رکھنے کے لیے توبہ کا دروازہ کھلا رکھا ہے تاکہ لوگوں کے لیے ایک امید باقی رہے کہ میں ”point of no return“ پر نہیں کھڑا ہوں کہ جہاں سے میرے لیے واپسی کا کوئی راستہ نہ ہو۔ ابھی میرے لیے واپس جانے کا امکان ہے۔ تو اس سے انسان کے اندر اصلاح کا مادہ پیدا ہوگا‘ ہمت پیدا ہوگی‘ ارادہ پیدا ہوگا اور وہ اپنے آپ کو درست کرلے گا۔

توبہ‘ احادیث کی روشنی میں

توبہ کا فلسفہ سمجھ لینے کے بعد اب توبہ کی اہمیت اور اس کی تاثیر کے بارے میں مختلف احادیث کا مطالعہ کرتے ہیں۔ ایسی چشم کشا اور اُمید افزا احادیث ہیں کہ ان کو سننے کے بعد کوئی انسان بھی رحمتِ الٰہی سے ناامید نہیں ہوسکتا۔ اس اعتبار سے آج ہماری گفتگو میں تبشیر کا پہلو زیادہ نمایاں ہوگا۔ ان میں سے بعض احادیث بہت مرتبہ میری گفتگو میں آچکی ہیں‘ لہٰذا اس وقت اُن کو مختصراً آپ کے سامنے رکھوں گا۔

حدیث ۱: حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

((كُلُّ بَنِيْ آدَمَ خَطَّاءٌ وَخَيْرُ الْخَطَّائِيْنَ التَّوَّابُوْنَ)) (۱)

”تمام بنی آدم بہت خطا کار ہیں‘ لیکن ان خطا کاروں میں بہتر وہ ہیں جو بار بار توبہ کرنے والے ہیں۔“

یعنی غلطی ہوگئی تو توبہ کرلیں۔ توبہ کے لیے یہ شرط نہیں ہے کہ پھر کبھی وہ غلطی نہ ہو۔ اصل

(۱) سنن ابن ماجہ‘ کتاب الزھد‘ باب ذکر التوبۃ۔ وسنن الترمذی‘ کتاب صفۃ القیامۃ والرقائق والورع۔

بات یہ ہے کہ اس وقت آپ یہ عہد کرلیں کہ یہ کام میں نے نہیں کرنا اور ایک دفعہ وہ کام چھوڑ دیں تو توبہ ہوگئی۔ اگر کچھ عرصے کے بعد آپ پھر جذبات کی رو میں بہہ گئے یا آپ پر برے اثرات پڑے اور آپ سے وہ غلطی دوبارہ سرزد ہوگئی‘ تو کوئی بات نہیں‘ آپ پھر توبہ کرلیں۔ اس لیے آپؐ نے فرمایا: ”اَلتَّوَّابُوْنَ“ یعنی بار بار توبہ کرنے والے۔

حدیث ۲: حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((اَلتَّائِبُ مِنَ الذَّنْبِ كَمَنْ لَا ذَنْبَ لَهٗ)) (۱)

”گناہ سے توبہ کرنے والا ایسے ہے جیسے اس نے کبھی گناہ کیا ہی نہیں۔“

اس کی مثال ایسے ہی ہے جیسے بچے تختی لکھنے کے بعد اسے دھوتے ہیں تو وہ اس طرح صاف ہوجاتی ہے جیسے کبھی اس پر کچھ لکھا ہی نہ گیا ہو۔ یہی حال توبہ کرنے والا کا ہے کہ جب انسان توبہ کرلیتا ہے تو وہ ایسے پاک صاف ہوجاتا ہے جیسے اس نے پہلے وہ گناہ کبھی کیا ہی نہ ہو۔ یہ حدیث قرآن کے ان الفاظ کی بعینہٖ تشریح ہے: ﴿عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يُّكَفِّرَ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ﴾ اور یہ عیسائیت کے عقیدۂ کفارہ کا رد ہے جو کہتے ہیں کہ حضرت آدم کے گناہ کا اثر ہر پیدا ہونے والا بچہ لے کر آتا ہے‘ حالانکہ حضرت آدم نے غلطی ہو جانے کے بعد اللہ کی طرف سے القا کیے گئے کلمات سے توبہ کرلی تھی اور اللہ نے ان کی توبہ کو قبول کرلیا تھا۔ چنانچہ حضرت آدم توبہ کے بعد ایسے پاک صاف ہوگئے جیسے انہوں نے وہ گناہ کیا ہی نہ ہو۔ اب جب گناہ ہی نہیں رہا تو پھر اس کا اثر ہر پیدا ہونے والے بچہ پر کیسے آسکتا ہے؟

حدیث ۳: اس حدیث کو پڑھ کر میں بھی چونک اٹھا تھا۔ ان احادیث کو بیان کرنے کا اصل مقصد یہ ہے کہ لوگوں کے دلوں میں مایوسی کا غلبہ نہ ہو۔ یہ بات نوٹ کرلیجیے کہ مایوسی ابلیسیت کا عکس ہے۔ مبلس اسے کہتے ہیں جو مایوس ہوگیا ہو اور ابلیس‘ سب سے بڑھ کر مایوس ہے‘ اس کو معلوم ہے کہ میرا چھٹکارا نہیں ہے‘ لہٰذا میں جتنے لوگوں کو اپنے ساتھ لے جا کر جہنم میں جھونک دوں‘ یہی میری کمائی ہے ـــــــ چنانچہ ”ابلیس“ کہتے ہی اسے ہیں جو

(۱) سنن ابن ماجہ‘ کتاب الزھد‘ باب ذکر التوبۃ۔

انتہائی مایوس ہو‘ جو رحمتِ خداوندی سے قطعاً مایوس ہو چکا ہو۔ اپنے دل و دماغ سے مایوسی کے سائے دُور کرنے کے لیے اس حدیث کا مطالعہ کیجیے۔ حضرت ابوہریرہ ؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِہٖ لَوْ لَمْ تُذْنِبُوْا لَذَھَبَ اللّٰہُ بِکُمْ وَلَجَاءَ بِقَوْمٍ یُذْنِبُوْنَ فَیَسْتَغْفِرُوْنَ اللّٰہَ فَیَغْفِرُ لَھُمْ))(۱)

’’قسم ہے اُس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے‘ اگر تم لوگ گناہ نہ کرتے تو اللہ تعالیٰ تم کو لے جاتا اور ایسے لوگوں کو لے آتا جو گناہ کرتے‘ پھر وہ اللہ سے استغفار کرتے (اور توبہ کرتے) تو اللہ تعالیٰ انہیں معاف کر دیتا۔‘‘

یہاں ایک اور بات نوٹ کر لیجیے کہ بعض چیزیں ایسی ہوتی ہیں کہ جن کا امرِ واقعہ سے کوئی تعلق نہیں ہوتا‘ لیکن زورِ بیان کے لیے‘ ایک بات کو emphasise کرنے کے لیے اس کا ذکر کیا جاتا ہے۔ جیسے قرآن مجید میں آتا ہے:

﴿قُلْ اِنْ کَانَ لِلرَّحْمٰنِ وَلَدٌ ۖ فَاَنَا اَوَّلُ الْعٰبِدِیْنَ ﴿۸۱﴾﴾ (الزخرف)

’’(اے نبی ﷺ!) کہہ دو اگر رحمٰن کا کوئی بیٹا ہوتو میں سب سے پہلے اس کو پوجوں گا۔‘‘

یعنی جب میں اللہ کی پرستش کرتا ہوں تو اگر اللہ کا کوئی بیٹا ہوتا تو کیا میں اس کی پرستش نہ کرتا؟ یہ انداز اختیار کر کے نفی پر زور دیا گیا ہے کہ اللہ کا کوئی بیٹا ہے ہی نہیں۔ اسی طرح اس حدیث کا اسلوبِ بیان بھی یہی ہے کہ اگر انسان گناہ نہ کرتے اور گناہ کے بعد توبہ کرنے سے اللہ تعالیٰ کی شانِ غفاری کا ظہور نہ ہوتا تو اللہ اور لوگوں کو لے آتا۔

تخلیق کائنات کا فلسفہ

’’اللہ تعالیٰ نے یہ کائنات کیوں پیدا کی؟‘‘ یہ عجیب فلسفے کی بات ہے اور میرے علم کی حد تک قرآن مجید میں اس کو براہِ راست زیر بحث نہیں لایا گیا۔ ہوسکتا ہے کہیں بہت خفی انداز میں اس مسئلہ کو بیان کیا گیا ہو اور یہ ابھی تک میری نگاہ سے مخفی ہو۔ قرآن مجید

(۱) صحیح مسلم‘ کتاب التوبۃ‘ باب سقوط الذنوب بالاستغفار توبۃ۔

کے بعض غامض نکات ایسے ہو سکتے ہیں کہ جن تک میری ابھی رسائی نہ ہوئی ہو۔ ایک دفعہ میرے بارے میں ایک عالمِ دین نے یہ کہہ دیا تھا کہ اسے قرآن پر بڑا عبور حاصل ہے‘ تو میں نے انہیں پیغام پہنچایا کہ آپ نے میرے بارے میں یہ دعویٰ کر کے قرآن کی توہین کی ہے‘ کیونکہ قرآن پر کسی انسان کو عبور نہیں ہو سکتا۔ عبور کا مفہوم یہ ہے کہ دریا کے دو کنارے ہیں اور آپ اِس کنارے سے اُس کنارے تک چلے گئے تو آپ نے دریا عبور کر لیا جبکہ قرآن تو ایک بحر ناپیدا کنار ہے۔ اس پر عبور کیسے حاصل ہو سکتا ہے؟ قرآن کے کتنے ہی ایسے غامض مقامات ہیں جہاں امام رازی بھی دہشت زدہ کھڑے نظر آتے ہیں۔ مثلاً سورۃ الحدید کی آیت ۳ کے الفاظ: ﴿ھُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاھِرُ وَالْبَاطِنُ ۚ﴾ پر امام رازی نے فرمایا: **اعلم ان ھذا المقام مقام غامض عمیق مھیب** ’’جان لو کہ یہ مقام بڑا عمیق‘ بڑا گہرا اور بہت پُرہیبت مقام ہے‘‘۔ اس کی تہہ تک پہنچنا کسی کے لیے ممکن نہیں ہے۔ ع ہُشدار کہ رہ بر دمِ تیغ است قدم را!

میں یہ بیان کر رہا تھا کہ اللہ نے یہ کائنات کیوں پیدا کی‘ اس سوال کا جواب براہِ راست قرآن میں موجود نہیں ہے۔ البتہ علامہ آلوسی اور بعض دیگر مفسرین نے ایک حدیث قدسی نقل کی ہے‘ جس میں اس سوال کا جواب موجود ہے: کُنْتُ کَنْزًا مَخْفِیًّا ’’میں ایک چھپے ہوئے خزانے کی مانند تھا‘‘۔ میرے اندر طاقت تھی‘ قوت تھی‘ خلاقی تھی‘ میری شانِ غفاری میرے اندر ہی اندر تھی۔ فَاَحْبَبْتُ اَنْ اُعْرَفَ ’’تو میں نے چاہا کہ مجھے پہچانا جائے‘‘۔ فَخَلَقْتُ الْخَلْقَ(۱) ’’تو (اس کے لیے) میں نے خلق کی تخلیق کی‘‘۔ کسی مخفی خزانے کی قدر و قیمت کا اندازہ تو اُسی وقت لگایا جا سکتا ہے جب وہ ظاہر ہو اور لوگ اس سے استفادہ کر سکیں۔ اسی طرح کسی کی قوت و طاقت کا اندازہ تب ہی لگایا

(۱) اس مفہوم کی احادیث الفاظ کی کمی بیشی کے ساتھ علامہ بدرالدین زرکشی نے اللآلی المنثورہ میں‘ علامہ سخاوی نے المقاصد الحسنۃ میں اور علامہ زرقانی نے مختصر المقاصد میں نقل کی ہیں۔ علامہ البانی نے اسے سلسلۃ الاحادیث الضعیفۃ والموضوعۃ (ح ۶۰۲۳) میں نقل کر کے لکھا ہے: لا اصل له اتفاقا۔

جاسکتا ہے جب اسے استعمال کیا جائے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے یہ چاہا کہ اس کی پوشیدہ صفات کا ظہور ہو تو اس نے اپنے اس مقصد کو پورا کرنے کے لیے ''خلق'' کی تخلیق کی۔ اس نے کائنات کو پیدا کر کے فرمایا کہ یہ میری تصویر ہے' مجھے اس کے ذریعے پہچانو۔ جیسے کوئی مصوّر اپنی تصویروں کی نمائش کرتا ہے کہ آؤ میرے فن پارے اور میرے شاہکار دیکھو' اسی طرح اللہ تعالیٰ نے بھی اس کائنات کو پیدا کر کے اپنی صفتِ تخلیق کا مظاہرہ کیا ہے اور اللہ یہ چاہتا ہے کہ اسے اس کی صفات کے ذریعے پہچانا جائے۔

قرآن حکیم میں جابجا اس کائنات میں غور و فکر کرنے کا حکم ملتا ہے:

﴿اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّھَارِ وَالْفُلْکِ الَّتِیْ تَجْرِیْ فِی الْبَحْرِ بِمَا یَنْفَعُ النَّاسَ وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْیَا بِہِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِھَا وَبَثَّ فِیْھَا مِنْ کُلِّ دَآبَّۃٍ۪ وَّتَصْرِیْفِ الرِّیٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَیْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ ﴿۱۶۴﴾﴾ (البقرۃ)

''یقیناً آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں' اور رات اور دن کے اُلٹ پھیر میں' اور اُن کشتیوں (اور جہازوں) میں جو سمندر میں (یا دریاؤں میں) لوگوں کے لیے نفع بخش سامان لے کر چلتی ہیں' اور اُس پانی میں کہ جو اللہ نے آسمان سے اُتارا ہے پھر اس سے زندگی بخشی زمین کو اس کے مُردہ ہو جانے کے بعد' اور ہر قسم کے حیوانات (اور چرند پرند) اس کے اندر پھیلا دیے اور ہواؤں کی گردش میں' اور ان بادلوں میں جو معلّق کر دیے گئے ہیں آسمان اور زمین کے درمیان' یقیناً نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو عقل سے کام لیں۔''

اور پھر اسی مقصد کے لیے انسان کو پیدا کیا جس میں یہ faculty of appreciation یعنی اللہ تعالیٰ کے حسن و جمال و کمال کو پہچاننے کی صلاحیت ہے' ورنہ ظاہر بات ہے کہ جمادات اللہ تعالیٰ کو کیا پہچانیں گے؟ اللہ کو پہچاننے کی صلاحیتیں صرف انسان میں ہیں۔ تو یہ ایک باقاعدہ فلسفہ ہے۔ اسی کے ضمن میں یہ بات سمجھ لیجیے کہ اگر گناہ نہ ہوتا' توبہ نہ ہوتی اور پھر اللہ کی طرف سے معافی کا اعلان نہ ہوتا تو اللہ تعالیٰ کی شانِ غفاری کا ظہور کیسے ہوتا؟ اسی لیے فرمایا کہ اگر تم لوگ گناہ نہ کرتے تو اللہ تمہیں ختم کر کے کوئی ایسی مخلوق پیدا

کرتا جو گناہ کرتے' پھر وہ توبہ کرتے اور پھر اللہ انہیں بخش دیتا۔

حدیث ۴: اسی سے ملتی جلتی ایک اور حدیث امام احمد اور امام بیہقی رحمہما اللہ لائے ہیں اور اس کے راوی حضرت علی رضی اللہ عنہ ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْعَبْدَ الْمُؤْمِنَ الْمُفَتَّنَ التَّوَّابَ))(۱)

''یقیناً اللہ اپنے اس مؤمن بندہ کو پسند کرتا ہے جو فتنوں میں سخت مبتلا ہو جاتا ہے اور پھر بہت توبہ کرتا ہے۔''

اب غور کرنے کی بات یہ ہے کہ اللہ کن سے محبت کرتا ہے؟ اس کا جواب قرآن میں ان الفاظ میں ملتا ہے: ﴿وَاللّٰہُ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ ﴿۱۳۴﴾﴾ (آل عمران) ''اللہ احسان کی روش اختیار کرنے والوں کو پسند کرتا ہے''۔ دوسری جگہ فرمایا: ﴿اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِہٖ صَفًّا کَاَنَّھُمْ بُنْیَانٌ مَّرْصُوْصٌ ﴿۴﴾﴾ (الصف) ''اللہ محبت کرتا ہے اپنے اُن بندوں سے جو اس کی راہ میں جنگ کرتے ہیں صفیں باندھ کر گویا سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہیں''۔ یہاں ایک تیسری چیز کا ذکر ہے کہ اللہ تعالیٰ محبت کرتا ہے اپنے اس مؤمن بندے سے جو فتنوں میں بہت زیادہ مبتلا ہو جاتا ہو اور پھر بہت توبہ کرتا ہو۔ یعنی وہ گناہ کرتا ہے' لیکن ساتھ ہی پلٹتا ہے' رجوع کرتا ہے' پھر اللہ کے حضور میں حاضر ہو کر معافی مانگتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کو ایسا بندہ بہت پسند ہے۔

باب التوبہ کا بند ہونا

اب کچھ اور احادیث ملاحظہ کیجیے' جن میں یہ بیان کیا جا رہا ہے کہ توبہ کا دروازہ ایک وقت آنے پر بند ہو جائے گا۔ خطاب کے ابتدا میں میں نے توبہ سے متعلق دو اصطلاحات بیان کی تھیں: اجتماعی توبہ اور انفرادی توبہ۔ اجتماعی سطح پر توبہ کا دروازہ تب تک بند نہیں ہو گا جب تک کہ سورج مغرب سے طلوع نہ ہو جائے۔ یہ قربِ قیامت کی آخری نشانیوں میں سے ایک ہے۔

---

(۱) مسند احمد' کتاب مسند العشرۃ المبشرین بالجنۃ' باب ومن مسند علی بن ابی طالب' ح ۵۷۱۔

حدیث ۵: مسلم شریف میں حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی اکرمﷺ نے فرمایا:

((مَنْ تَابَ قَبْلَ اَنْ تَطْلُعَ الشَّمْسُ مِنْ مَغْرِبِهَا تَابَ اللّٰهُ عَلَيْهِ)) (۱)

''جس نے سورج کے مغرب سے طلوع ہونے سے پہلے پہلے توبہ کر لی تو اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول کر لے گا۔''

البتہ جب قیامت کی یہ نشانی ظاہر ہو جائے کہ سورج مغرب سے طلوع ہو رہا ہو تو اب اجتماعی سطح پر توبہ کا دروازہ بند ہو گیا۔ اس کے بعد اگر کوئی توبہ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول نہیں کرے گا۔

یہ تو اجتماعی سطح پر توبہ کے عدم قبولیت کی بات ہوئی' جبکہ انفرادی سطح پر توبہ کی قبولیت کا امکان تب تک رہے گا جب تک حالتِ نزع نہ واقع ہو جائے۔ یہ اصل میں اللہ تعالیٰ کی رحمانیت کے مظاہر ہیں جو میں آپ کے سامنے بیان کر رہا ہوں کہ مایوسی کی کوئی بات نہیں' آخری وقت آنے تک توبہ کا دروازہ کھلا ہے۔ لیکن جب وہ وقت آ گیا تو پھر توبہ کا دروازہ بند ہو جائے گا۔

حدیث ۶: ترمذی میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے' نبی کریمﷺ نے فرمایا:

((اِنَّ اللّٰهَ يَقْبَلُ تَوْبَةَ الْعَبْدِ مَالَمْ يُغَرْغِرْ)) (۲)

''اللہ تعالیٰ اپنے بندے کی توبہ قبول کرتا رہے گا جب تک کہ حلق کے اندر گھنگرو نہ بولے۔''

یعنی عالمِ نزع واقع ہو جائے۔ جب کسی کی موت کے آثار اتنے واضح ہو گئے ہوں کہ اب زندگی کا کوئی امکان باقی نہ رہے تو اس وقت کی توبہ قبول نہیں ہو گی۔

توبہ ' مسرتِ الٰہی کا ذریعہ

ایک حدیث میں توبہ کرنے والے شخص کے لیے ایک تمثیل بیان کی گئی ہے' جس کا

(۱) صحیح مسلم' کتاب الذکر والدعاء والتوبة والاستغفار' باب استحباب الاستغفار والاستکثار منه۔

(۲) سنن الترمذی' کتاب الدعوات عن رسول اللهﷺ' باب فی فضل التوبة والاستغفار وما ذکر من رحمة الله۔

ترجمہ تو میں بہت دفعہ بیان کر چکا ہوں' لیکن آج میں چاہتا ہوں کہ اس کو پورے متن کے ساتھ آپ کے سامنے رکھوں۔

حدیث ۷: یہ حضرت انس بن مالکؓ (جو حضورﷺ کے خادم خاص تھے) سے مروی متفق علیہ روایت ہے' یعنی صحیح بخاری اور صحیح مسلم دونوں میں الفاظ کے تھوڑے سے فرق کے ساتھ موجود ہے۔ مسلم شریف[1] کی روایت کے الفاظ یہ ہیں:

((لَلّٰهُ اَشَدُّ فَرَحًا بِتَوْبَةِ عَبْدِهٖ حِيْنَ يَتُوْبُ اِلَيْهِ)) ''جان لو اللہ تعالیٰ کو زیادہ خوشی ہوتی ہے اپنے کسی گناہگار بندے کی توبہ سے جب وہ اس کے حضور توبہ کرتا ہے'' ((مِنْ اَحَدِكُمْ)) ''تم میں سے ایک ایسے شخص سے بڑھ کر (خوشی ہوتی ہے)'' ((كَانَ عَلٰى رَاحِلَتِهٖ بِاَرْضِ فَلَاةٍ)) ''جو بہت ہی دور دراز کے (سنسان) علاقے میں سفر کر رہا تھا''۔ ((فَانْفَلَتَتْ مِنْهُ)) ''تو اس سے اس کی سواری گم ہو گئی''۔ ((وَعَلَيْهَا طَعَامُهٗ وَشَرَابُهٗ)) ''اسی پر اس کا کھانا بھی تھا اور پانی بھی''۔ یعنی وہ اپنی اونٹنی پر سفر کر رہا تھا' اسی پر اس کا سامانِ سفر تھا۔ تھوڑی دیر کے لیے کہیں ستانے کے لیے بیٹھا' اسے اونگھ آ گئی اور جب آنکھ کھلی تو اونٹنی غائب تھی۔ ((فَاَيِسَ مِنْهَا)) ''وہ تلاش کر کے مایوس ہو گیا''۔ یعنی کہیں اونٹنی کا سراغ نہیں ملا۔ اب ظاہر بات ہے کہ اسے اپنی یقینی موت آنکھوں کے سامنے نظر آ رہی ہے۔ ((فَاَتٰى شَجَرَةً فَاضْطَجَعَ فِیْ ظِلِّهَا قَدْ اَيِسَ مِنْ رَاحِلَتِهٖ)) ''تو وہ ایک درخت کے سائے میں اپنی سواری سے مایوس ہو کر لیٹ گیا''۔ گویا وہ موت کے انتظار میں لیٹ گیا کہ اب تو موت آنی ہی آنی ہے۔ ((فَبَيْنَا هُوَ كَذٰلِكَ اِذَا هُوَ بِهَا قَائِمَةً عِنْدَهٗ)) ''(اس کی کہیں دوبارہ آنکھ لگ گئی۔ جب آنکھ کھلی) تو کیا دیکھتا ہے کہ اونٹنی تو اس کے پاس کھڑی ہے''۔ ((فَاَخَذَ بِخِطَامِهَا)) ''تو اس نے فوراً اس کی رسّی پکڑ لی'' ((ثُمَّ قَالَ مِنْ شِدَّةِ الْفَرَحِ)) ''پھر خوشی کی شدت سے وہ پکار اٹھا''۔ اب اسے جو مسرت اور خوشی حاصل ہوئی اس کا آپ اندازہ نہیں کر سکتے۔ ایک ویران صحرا میں سواری اور سامانِ سفر کے گم ہو جانے سے موت کا معاملہ یقینی نظر آ رہا تھا تو اچانک اللہ تعالیٰ نے

(۱) صحیح مسلم' کتاب التوبة' باب فی الحض علی التوبة والفرح بها۔

وہ کھوئی ہوئی اونٹنی واپس دلادی۔ اس موقع پر وہ اللہ کا شکر ادا کرنے کے لیے کہنا تو یہ چاہتا تھا کہ اے اللہ تو میرا رب اور میں تیرا بندہ ہوں' لیکن فرطِ مسرّت میں اور شادیٔ مرگ یعنی خوشی کی وجہ سے موت طاری ہو جانے کی کیفیت میں اس کی زبان ایسی لڑکھڑائی کہ اس کی زبان سے نکلا: ((اَللّٰھُمَّ اَنْتَ عَبْدِیْ وَاَنَا رَبُّکَ)) ''اے اللہ تو میرا بندہ ہے اور میں تیرا ربّ ہوں!'' ((اَخْطَأَ مِنْ شِدَّۃِ الْفَرَحِ)) یعنی ''خوشی کی شدّت سے وہ غلطی کر بیٹھا'' ـــــ یہ فرطِ مسرت اور خوشی کی انتہا ہے جس میں انسان اتنی بڑی خطا کر بیٹھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کو اپنے کسی گناہگار بندے کی توبہ سے اس سے بھی زیادہ خوشی ہوتی ہے۔

یہ تمثیل اس لیے بیان کی گئی کہ بعض حقائق اتنے لطیف ہوتے ہیں کہ ان کو بتمام و کمال بیان نہیں کیا جا سکتا اور اس کے لیے مثالوں کا سہارا لیا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کو اپنے گناہگار بندے کی توبہ پر کتنی خوشی ہوتی ہے' اسے آپ کیا سمجھیں گے! لہٰذا یہ مثال دے کر آپ کو سمجھایا گیا کہ ایک لق و دق صحرا میں انسان سفر کر رہا ہے' اس کے پاس ایک ہی اونٹنی ہے' اسی پر اس کا کھانے پینے کا سامان ہے' وہ کہیں تھوڑی دیر کے لیے ٹھہرا ہے اور اونٹنی غائب ہو گئی۔ اس نے اونٹنی کو تلاش کرنے کے لیے ہر طرف دیکھ لیا لیکن کامیاب نہ ہو سکا تو اب موت کے انتظار میں ایک درخت کے سائے میں لیٹ گیا اور اس کی آنکھ لگ گئی۔ اب جیسے ہی اس کی آنکھ کھلی تو کیا دیکھتا ہے کہ اونٹنی موجود ہے تو وہ شدّتِ فرح میں یہ کہہ بیٹھتا ہے: ((اَللّٰھُمَّ اَنْتَ عَبْدِیْ وَاَنَا رَبُّکَ)) ـــــ اس شخص کی خوشی کا تو آپ اندازہ لگا سکتے ہیں' لیکن جب ایک گناہگار بندہ اللہ کی جناب میں توبہ کرتا ہے تو اللہ کو اس پر کتنی خوشی ہوتی ہے' اس کا آپ اندازہ بھی نہیں لگا سکتے' چنانچہ یہ مثال ہمیں سمجھانے کے لیے دی گئی ہے۔

تسلسل گناہ کے باوجود توبہ کی قبولیت

اب میں ایک اور حدیث بیان کرتا ہوں' لیکن اس سے پہلے یہ سمجھ لیجیے کہ اللہ تعالیٰ نے جو انسان پیدا کیے ہیں ان کے مزاج مختلف ہیں۔ ان میں کچھ لوگ قوی ارادے کے مالک ہوتے ہیں کہ ایک دفعہ جب فیصلہ کر لیا تو اس پر ڈٹ گئے' لیکن کچھ لوگوں میں قوت

ارادی اتنی مضبوط نہیں ہوتی' وہ اِدھر اُدھر سوچتے رہتے ہیں۔ ایسے لوگوں سے خطاؤں کا ظہور ہو جاتا ہے تو وہ توبہ کر لیتے ہیں۔ پھر کچھ عرصے کے بعد ان سے خطا کا ظہور ہو جاتا ہے تو وہ پھر توبہ کر لیتے ہیں' یعنی وہ توبہ کے بعد ہر دفعہ گناہ کر بیٹھتے ہیں۔ اب ہم اگر ان کے اس عمل یعنی بار بار خطا کر کے توبہ کرنے کو کسی دنیاوی عمل پر قیاس کریں تو ہم بھی یہی کہیں گے کہ ان کے اس طرح بار بار توبہ کرنے سے ایک وقت ایسا آئے گا کہ ان کی توبہ قبول نہیں کی جائے گی' جیسے مالک ملازم کی غلطی کو ایک دو بار تو معاف کرتا ہے لیکن اگر وہ مسلسل غلطیاں کرتا رہے تو مالک اسے معاف نہیں کرتا بلکہ سزا دیتا ہے۔ لیکن توبہ کا فلسفہ اس سے بالکل مختلف ہے کہ ہزار بار توبہ کرنے کے باوجود انسان سے گناہ سرزد ہو جائے اور وہ پھر اللہ تعالیٰ سے معافی مانگے تو اللہ اس کی توبہ کو قبول کرتا ہے۔

حدیث ۸: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا:

((اِنَّ عَبْدًا اَذْنَبَ ذَنْبًا)) ''یقیناً ایک بندہ گناہ کرتا ہے''۔ ((فَقَالَ: رَبِّ اَذْنَبْتُ فَاغْفِرْلِیْ)) ''پھر وہ کہتا ہے: اے پروردگار! مجھ سے گناہ ہو گیا ہے' مجھے معاف فرما دے''۔ ((فَقَالَ رَبُّہٗ)) ''تو پروردگار کہتا ہے:'' ((أَعَلِمَ عَبْدِیْ اَنَّ لَہٗ رَبًّا یَغْفِرُ الذَّنْبَ وَیَاْخُذُ بِہٖ)) ''کیا میرا یہ بندہ جانتا ہے کہ اس کا ایک ربّ ہے جو گناہ معاف بھی کر سکتا ہے اور اس کی سزا بھی دے سکتا ہے؟'' یعنی وہ جانتا ہے کہ اس کا ایک پالنے والا ہے جو چاہے تو اسے معاف کر دے اور چاہے تو اسے سزا دے دے۔ اس کے صرف اس جاننے کی بنیاد پر' اس کے اس علم اور اس کے اس ایمان کی بنیاد پر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ((غَفَرْتُ لِعَبْدِیْ)) ''میں نے اپنے بندے کو معاف کیا''۔ ((ثُمَّ مَکَثَ مَا شَاءَ اللّٰہُ)) ''پھر وقت گزرا جتنا کہ اللہ نے چاہا''۔ ((ثُمَّ اَذْنَبَ ذَنْبًا)) ''پھر اس سے گناہ ہو گیا''۔ ((فَقَالَ: رَبِّ اَذْنَبْتُ فَاغْفِرْہُ)) ''وہ پھر کہتا ہے: اے پروردگار! مجھ سے گناہ ہو گیا ہے پس تو مجھے معاف فرما دے''۔ ((فَقَالَ)) ''(تو اس کا ربّ) فرماتا ہے'' ((أَعَلِمَ عَبْدِیْ اَنَّ لَہٗ رَبًّا یَغْفِرُ الذَّنْبَ وَیَاْخُذُ بِہٖ)) ''کیا میرے بندے کو یہ معلوم

ہے کہ اس کا ایک رب ہے جو گناہ معاف بھی کر سکتا ہے اور چاہے تو اس پر پکڑ بھی سکتا ہے (سزا بھی دے سکتا ہے)''۔ تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ((غَفَرْتُ لِعَبْدِیْ)) ''میں نے اپنے بندے کو معاف کر دیا''۔ ((ثُمَّ مَکَثَ مَا شَاءَ اللّٰہُ)) ''پھر ایک عرصہ گزرا جتنا کہ اللہ نے چاہا''۔ ((ثُمَّ اَذْنَبَ ذَنْبًا)) ''پھر اس سے گناہ ہو گیا''۔ ((قَالَ قَالَ رَبِّ اَذْنَبْتُ آخَرَ)) ''اس نے کہا: پروردگار میں نے تو پھر ایک اور گناہ کر دیا'' ((فَاغْفِرْہُ لِیْ)) ''پس مجھے بخش دے''۔ ((فَقَالَ: أَعَلِمَ عَبْدِیْ اَنَّ لَہٗ رَبًّا یَغْفِرُ الذَّنْبَ وَیَاْخُذُ بِہٖ)) ''اللہ فرماتا ہے: کیا میرا بندہ جانتا ہے کہ اس کا ایک رب ہے (جسے وہ پکار رہا ہے اور وہ یہ جانتا ہے کہ اسے اختیار حاصل ہے کہ) چاہے تو بخش دے اور چاہے تو پکڑ لے''۔ اللہ فرماتا ہے کہ اُس کے اِس علم' اس ایمان کی بنیاد پر میں نے اسے معاف کر دیا: ((غَفَرْتُ لِعَبْدِیْ ثَلَاثًا فَلْیَعْمَلْ مَا شَاءَ))[1] ''میں نے اپنے بندے کو تینوں دفعہ معاف کر دیا۔ بس وہ اب جو چاہے کرے۔''

تو یہ ہے توبہ کا فلسفہ اور خالق کائنات کی شانِ غفاری کہ ایک بندہ بار بار گناہ کرتا ہے اور پھر اللہ سے معافی مانگتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے ہر بار معاف کر دیتے ہیں' اس کی توبہ قبول کر لیتے ہیں صرف اس بنا پر کہ اس کے دل میں ایمان باللہ اور اللہ کا ڈر موجود ہے جو اسے ہر بار توبہ پر اکساتا ہے۔

توبہ سے ناامیدی جرم ہے

ایک اور حدیث ملاحظہ کیجیے جس سے واضح ہوتا ہے کہ گناہوں کی کثرت کے باوجود توبہ سے ناامید ہونا اور بالخصوص کسی کو توبہ سے ناامید کرنا کتنا بڑا جرم ہے۔ قرآن حکیم میں اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہونے کا واضح حکم ملتا ہے: ﴿قُلْ یٰعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓی اَنْفُسِھِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَۃِ اللّٰہِ ط﴾ (الزمر:۵۳) ''(اے نبی ﷺ) کہہ دیجیے' اے میرے وہ بندو جنہوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا ہے' اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہوں!'' ہمارے بعض واعظین کا بھی یہ طرزِ عمل ہے کہ وہ کسی کو گناہ سے روکتے

(۱) صحیح البخاری' کتاب التوحید' باب قول اللہ تعالیٰ ﴿یُرِیْدُوْنَ اَنْ یُّبَدِّلُوْا کَلَامَ اللّٰہِ﴾۔

رہتے ہیں' لیکن جب وہ بار بار منع کرنے کے باوجود باز نہیں آتا تو غصہ میں کہہ دیتے ہیں کہ ''اللہ تمہیں کبھی معاف نہیں کرے گا''۔ کسی بندے کو اس کے ربّ کی رحمت سے مایوس کرنا کتنا بڑا جرم ہے' درج ذیل حدیث سے آپ کو اس کا اندازہ ہو جائے گا۔

حدیث ۹: مسلم شریف میں حضرت جندب رضی اللہ عنہ کی روایت ہے' رسول اللہ ﷺ نے ایک واقعہ بیان کیا:

((اَنَّ رَجُلًا قَالَ: وَاللّٰہِ لَا یَغْفِرُ اللّٰہُ لِفُلَانٍ ' وَاِنَّ اللّٰہَ تَعَالٰی قَالَ: مَنْ ذَاالَّذِیْ یَتَأَلّٰی عَلَیَّ اَنْ لَا اَغْفِرَ لِفُلَانٍ؟ فَاِنِّیْ قَدْ غَفَرْتُ لِفُلَانٍ وَاَحْبَطْتُ عَمَلَكَ))[1]

''ایک شخص نے یہ کہا: اللہ کی قسم' اللہ تعالیٰ فلاں شخص کو کبھی معاف نہیں کرے گا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: یہ کون ہے جو میرے اوپر حاکم ہونے کا دعوے دار ہے (یعنی میری طرف سے حکم لگا رہا ہے) کہ میں فلاں شخص کو معاف نہیں کروں گا! اس کو تو میں نے معاف کر دیا اور اس شخص کے تمام اعمال میں نے ضائع کر دیے (یعنی اس شخص نے میرے بندے کو میری رحمت اور شانِ غفاری سے مایوس کیا تھا اس لیے میں نے اس کے تمام اعمال ضائع کر دیے)۔''

اس لیے کبھی بھی کسی بُرے سے بُرے شخص کے بارے میں ایسا گمان نہیں کرنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ اسے ہدایت دے سکتا ہے' اس کے لیے راستہ کھول سکتا ہے۔ دوسری بات یہ بھی یاد رکھیں کہ انسان کو اپنی نیکی پر کبھی زعم نہیں ہونا چاہیے۔ اس حدیث میں جس شخص کا ذکر ہے' یہ وہی شخص ہوگا جو اپنی نیکی پر زعم رکھتا ہوگا۔ اسی لیے تو اس نے کہا کہ ''اللہ تعالیٰ فلاں شخص کو کبھی معاف نہیں کرے گا۔''

توبہ کی تاثیر

مندرجہ ذیل حدیث سے آپ کو توبہ کی عظمت اور اس کی تاثیر کا اندازہ ہو جائے گا۔ یہ بہت ہی عجیب اور لمبی حدیث ہے۔ الفاظ کے تھوڑے سے فرق کے ساتھ یہ حدیث

(۱) صحیح مسلم' کتاب البر والصلۃ والآداب' باب النھی عن تقنیط الانسان من رحمۃ اللہ تعالیٰ۔

بخاری و مسلم[1] دونوں میں موجود ہے۔ یہاں مسلم کے الفاظ نقل کیے جا رہے ہیں۔

حدیث ۱۰: حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((كَانَ فِيمَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ رَجُلٌ قَتَلَ تِسْعَةً وَتِسْعِينَ نَفْسًا)) ''تم سے پہلے جو اُمّت تھی (بنی اسرائیل) اس میں ایک آدمی نے ۹۹ قتل کیے تھے''۔ اب آپ اندازہ کیجیے کہ وہ کتنا بڑا گناہگار تھا۔ قرآن مجید میں آتا ہے: ﴿مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا﴾ (المائدۃ:۳۲) ''جس نے کسی ایک انسان کو بھی جان کے بدلے یا زمین میں فساد پھیلانے کے سوا کسی اور وجہ سے قتل کیا گویا اس نے پوری نوعِ انسانی کو قتل کر دیا''۔ جبکہ اس نے تو ۹۹ قتل کیے تھے۔ لیکن پھر اس کے اندر توبہ کا جذبہ پیدا ہوا۔ ((فَسَاَلَ عَنْ اَعْلَمِ اَهْلِ الْاَرْضِ)) ''تو اس نے لوگوں سے پوچھا کہ اہل زمین میں کون سب سے بڑا عالم ہے؟'' ((فَدُلَّ عَلٰى رَاهِبٍ)) ''تو اس کی رہنمائی کی گئی ایک راہب کی طرف (کہ وہ بہت نیک اور بڑا عالم ہے)''۔ ((فَاَتَاهُ)) ''وہ اس کے پاس آیا''۔ ((فَقَالَ اِنَّهٗ قَتَلَ تِسْعَةً وَتِسْعِينَ نَفْسًا فَهَلْ لَهٗ مِنْ تَوْبَةٍ؟)) ''اس نے (راہب کو) بتایا کہ اس نے ۹۹ قتل کیے ہیں، تو کیا اس کے لیے توبہ کا کوئی امکان ہے؟'' ((فَقَالَ: لَا)) ''اس نے کہا: نہیں''۔ ((فَقَتَلَهٗ)) ''اس نے اس (راہب) کو بھی قتل کر دیا''۔ ((فَكَمَّلَ بِهٖ مِائَةً)) ''تو اس نے سو کی تعداد پوری کر لی''۔ ((ثُمَّ سَاَلَ عَنْ اَعْلَمِ اَهْلِ الْاَرْضِ)) ''پھر اس نے پوچھا اہل زمین میں کوئی اور بڑا عالم انسان ہے؟'' ((فَدُلَّ عَلٰى رَجُلٍ عَالِمٍ)) ''تو اس کی رہنمائی کی گئی ایک بڑے عالم کی طرف''۔ ((فَقَالَ اِنَّهٗ قَتَلَ مِائَةَ نَفْسٍ)) ''تو اس نے (وہاں جا کر) کہا کہ وہ سو انسان قتل کر چکا ہے''۔ ((فَهَلْ لَهٗ مِنْ تَوْبَةٍ)) ''تو کیا اس کے لیے توبہ کا کوئی امکان ہے؟'' ((فَقَالَ نَعَمْ)) ''اس نے کہا: کیوں نہیں!'' اُس نے سو قتل کیے تھے لیکن پھر بھی توبہ کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔ انفرادی سطح پر توبہ کا دروازہ تب تک بند نہیں ہوگا جب تک کہ

(۱) صحیح البخاری، کتاب احادیث الانبیاء، باب حدیث الغار۔ وصحیح مسلم، کتاب التوبۃ، باب قبول توبۃ القاتل وان کثر قتلہ۔

عالمِ نزع کی کیفیت ظاہر نہیں ہو جاتی جیسے ہم نے ماقبل میں بیان کیا۔ اس لیے اس عالم نے کہا کہ تمہارے لیے توبہ کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔ ((وَمَنْ يَحُوْلُ بَيْنَهٗ وَبَيْنَ التَّوْبَةِ)) ''(اور کہا کہ) تمہارے اور تمہاری توبہ کے درمیان کون حائل ہو سکتا ہے؟'' یعنی کوئی حائل نہیں ہو سکتا۔ تمہاری توبہ کا دروازہ کھلا ہے۔ لیکن ساتھ ہی کہا: ((اِنْطَلِقْ اِلٰى اَرْضِ كَذَا وَكَذَا)) ''تم فلاں جگہ چلے جاؤ''۔ یعنی جہاں تم رہتے ہو وہاں واپس نہ جاؤ۔ وہاں کا ماحول اچھا نہیں ہے، معاشرہ اچھا نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ تم توبہ پر قائم نہ رہ سکو۔ تم فلاں جگہ چلے جاؤ، وہاں اچھے لوگ آباد ہیں، ان میں جا کر رہو۔ ((فَاِنَّ بِهَا اُنَاسًا يَعْبُدُوْنَ اللّٰهَ)) ''وہاں ایسے لوگ آباد ہیں جو اللہ کی بندگی کرتے ہیں'' ((فَاعْبُدُ اللّٰهَ مَعَهُمْ)) ''تو تم ان کے ساتھ مل کر اللہ کی بندگی (اور پرستش) کرو'' ((وَلَا تَرْجِعْ اِلٰى اَرْضِكَ)) ''اور اپنی زمین کی طرف (اپنے وطن میں) واپس مت جاؤ'' ((فَاِنَّهَا اَرْضُ سَوْءٍ)) ''کیونکہ وہ بُری جگہ ہے۔''

یہاں یہ بات بھی نوٹ کر لیجیے کہ ماحول کا انسان کی زندگی پر گہرا اثر ہوتا ہے۔ نیکوکار کی صحبت انسان کو اچھائی کی طرف لے جاتی ہے جبکہ بُروں کی صحبت انسان کو برائی کے گڑھے میں دھکیل دیتی ہے۔ اس لیے اس عالم نے اسے یہ نصیحت کی کہ تم نے جب توبہ کر لی ہے تو تم اب اپنے علاقے میں واپس مت جانا کیونکہ وہاں اکثریت برے اور بگڑے ہوئے لوگوں کی ہے، کہیں تم وہاں رہ کر اپنی توبہ سے پھسل نہ جاؤ اور پھر برائی میں نہ پڑ جاؤ۔ تم فلاں علاقہ میں چلے جاؤ، وہاں نیک اور اہلِ علم لوگ بستے ہیں، ان کی صحبت میں رہ کر تم اپنی زندگی کے باقی ایام اپنے ربّ کی عبادت میں گزارو۔

((فَانْطَلَقَ)) ''تو وہ چل پڑا''۔ ((حَتّٰى اِذَا نَصَفَ الطَّرِيْقَ اَتَاهُ الْمَوْتُ)) ''یہاں تک کہ جب اس نے آدھا راستہ طے کر لیا تو اس کو موت آ گئی''۔ اور وہاں اس کی جان قبض کرنے کے لیے جنّت اور دوزخ دونوں کے فرشتے آ گئے۔ ((فَاخْتَصَمَتْ فِيْهِ مَلَائِكَةُ الرَّحْمَةِ وَمَلَائِكَةُ الْعَذَابِ)) ''پس اس کے بارے میں رحمت اور عذاب کے فرشتے جھگڑ پڑے''۔ ((فَقَالَتْ مَلَائِكَةُ الرَّحْمَةِ)) ''رحمت والے (یعنی

جنت والے) فرشتوں نے کہا'': ((جَاءَ تَائِبًا مُقْبِلًا بِقَلْبِهٖ اِلَى اللّٰهِ)) ''یہ شخص خلوص سے توبہ کر کے اللہ تعالیٰ کی طرف ہجرت کر رہا تھا''۔ اس لیے اس کی نیّت کی بنیاد پر اب یہ جنتی ہے۔ لہٰذا اس کی روح ہم قبض کریں گے اور اسے جنّت میں لے جائیں گے۔ ((وَقَالَتْ مَلَائِكَةُ الْعَذَابِ)) ''اور عذاب والے فرشتے کہنے لگے'': ((اِنَّهٗ لَمْ يَعْمَلْ خَيْرًا قَطُّ)) ''اس نے کبھی کوئی نیک عمل تو کیا ہی نہیں''۔ تو کس بنیاد پر اس کو تم جنت میں لے جاؤ گے؟ اس کو تو دوزخ میں جانا چاہیے۔ ((فَاَتَاهُمْ مَلَكٌ فِيْ صُوْرَةِ آدَمِيٍّ)) ''تو ان کے پاس (اللہ نے) ایک اور فرشتے کو انسانی شکل میں بھیج دیا''۔ ((فَجَعَلُوْهُ بَيْنَهُمْ)) ''تو ان فرشتوں نے اس کو اپنے درمیان ثالث بنا لیا''۔ یعنی یہ کہا کہ ہمارے درمیان فیصلہ کر دو کہ کون اس کی روح قبض کرنے کے حق دار ہیں' جنت والے یا جہنم والے؟ ((فَقَالَ قِيْسُوْا مَا بَيْنَ الْاَرْضَيْنِ فَاِلٰى اَيَّتِهِمَا كَانَ اَدْنٰى فَهُوَ لَهٗ)) ''اس نے کہا تم دونوں جگہوں کا فاصلہ ناپ لو (یعنی جہاں سے وہ چلا ہے وہ اس موت والی جگہ کے زیادہ قریب ہے یا جہاں وہ جا رہا تھا؟) جس زمین کے زیادہ قریب ہو وہی اس کا حکم ہے''۔ ((فَقَاسُوْهُ فَوَجَدُوْهُ اَدْنٰى اِلَى الْاَرْضِ الَّتِيْ اَرَادَ)) ''جب فاصلہ ناپا گیا تو جس طرف وہ جا رہا تھا وہ جگہ زیادہ قریب نکلی''۔ ایک حدیث میں یہ بھی مذکور ہے کہ جب فاصلہ ناپا جانے لگا تو اللہ تعالیٰ نے ایک طرف والی زمین کو حکم دے دیا کہ تو سکڑ جا اور دوسری طرف والی کو حکم دیا کہ تو پھیل جا' تاکہ جدھر وہ جا رہا تھا وہ بستی زیادہ قریب ہو جائے بہ نسبت اس کے کہ جہاں سے وہ چلا تھا۔ ((فَقَبَضَتْهُ مَلَائِكَةُ الرَّحْمَةِ)) ''چنانچہ رحمت کے فرشتے اس بندے کو (جنت میں) لے گئے''۔ یہ ہے توبہ کی عظمت اور اس کی تاثیر۔

اجتماعی گناہ اور اجتماعی توبہ

ایک ہے انفرادی گناہ اور ایک ہے اجتماعی گناہ۔ یہ ساری باتیں جو میں نے اب تک بیان کیں ان میں سے زیادہ کا تعلق انفرادی گناہوں سے ہے۔ اب دیکھتے ہیں کہ اجتماعی گناہ کیا ہے؟ پوری قوم غلط راستے پر جا رہی ہے۔ ملک میں اللہ کا نہیں بلکہ

انسانی حاکمیت پر مبنی دستور نافذ ہے جو سراسر کفر ہے' شرک ہے۔ پورا معاشی نظام سود اور جوئے پر مبنی ہے۔ ٹھیک ہے کچھ لوگ بچے ہوں گے' لیکن وہ تو معدودے چند ہوں گے۔ سیاسی نظام سے تو بچا ہوا کوئی بھی نہیں ہے۔ ہم سب اس ملک میں رہ رہے ہیں' ہم اس کے شہری ہیں' لہٰذا اگر یہاں غیر اسلامی قوانین نافذ ہیں تو ہم سب مجرم ہیں۔ اسی طرح کا معاملہ معاشی نظام کا ہے۔ اگر ایک شخص بالفرض سود سے براہِ راست بچ بھی گیا تب بھی سود کے غبار سے' جس کو حدیث میں ''دخان'' کہا گیا ہے' اس دخان اور دھوئیں سے تو کوئی نہیں بچ سکتا۔ وہ تو جیسے فضا کے اندر کبھی غبار (dust-suspension) ہو جاتا ہے' آپ سانس لیں گے تو غبار اندر جائے گا' اسی طرح ہر شخص کے اندر سود جا رہا ہے۔

فرض کیجیے آپ نے اپنے گھر میں اللہ تعالیٰ کی توفیق سے شرعی پردہ بھی نافذ کیا ہے' ستر و حجاب کے احکام بھی ہیں لیکن پورے معاشرے کا رنگ کیا ہے؟ بے حیائی ہے' فحاشی ہے' عریانی ہے۔ اخبار گھر میں چل کر آ رہا ہے تو کون سی تصویریں لے کر آتا ہے؟ ایک زمانہ تھا' رنگین تصویریں اخبارات کے اندر شائع نہیں ہوتی تھیں اور اب بھی دنیا کے اندر ایسا ہی ہے۔ اخبارات میں صرف وہی تصویریں چھپتی ہیں جو کسی واقعہ (event) یا خبر سے متعلق ہوں اور وہ بھی بلیک اینڈ وائٹ ہوتی ہیں۔ ان کے ہاں فحاشی کے دلدادہ لوگوں کے لیے رسالے علیحدہ ہیں' ان میں تو عریانی کی انتہا ہوتی ہے' لیکن وہ جو چاہے لے لے۔ جبکہ ہم نے خبریں پڑھنی ہیں تو ہمیں وہ اخبار دیا جا رہا ہے جس کے اندر یہ ساری تصویریں ہیں۔ کاہے کے لیے؟ یہ ہمارے گھر میں آ رہی ہیں' ہماری بچیاں دیکھ رہی ہیں ان تصویروں کو۔ کیا انہیں یہ خبر دی جا رہی ہے' یہ سبق دیا جا رہا ہے کہ اصل عزّت تو ان اداکاراؤں کی ہے' اصل عزت تو تھیٹر والوں اور ناچنے والوں کی ہے! مجھے یاد ہے کہ لاہور میں ''مشرق'' نے یہ رنگین تصاویر کا سلسلہ شروع کیا تھا' اس سے پہلے اخبارات میں یہ نہیں تھا۔ البتہ اخبارات میں فلموں کے اشتہارات وغیرہ قیامِ پاکستان کے بعد ہی چھپنے شروع ہو گئے تھے۔ اُس وقت ''نوائے وقت'' اس قباحت سے بچا ہوا تھا۔ چنانچہ ۱۹۴۹ء میں حمید نظامی صاحب نے ''نوائے وقت'' میں ''گھر میں سانپ'' کے عنوان

سے ایک اشتہار شائع کیا تھا کہ اس قسم کی تصویریں اور اشتہارات لے کر جو اخبار آپ کے گھر آ رہا ہے وہ ایسے ہی ہے جیسے ایک سانپ آپ کے گھر میں داخل ہو گیا ہو۔ فلموں کے اشتہارات جس قسم کی مخربِ اخلاق تصویروں کے ساتھ چھپتے ہیں‘ آپ کے بچے اور بچیاں انہیں دیکھتے ہیں۔ یہ سانپ ہے سانپ! آج کوئی بھی اخبار اس سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ فحاشی کے نئے سے نئے طریقے اپنائے جا رہے ہیں کہ یہ بہار کے رنگ ہیں‘ یہ سرما کے رنگ ہیں‘ یہ گرما کے رنگ ہیں۔ فیشن شو ہو رہے ہیں‘ یہ لباس کا مقابلہ ہو رہا ہے‘ یہ حسن کے مقابلے ہو رہے ہیں‘ نعوذ باللہ من ذالک۔ اب ہم اس معاشرے میں رہ رہے ہیں تو ہم ایک اجتماعی گناہ کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ اس سے بھی توبہ کی کوئی شکل ہے یا نہیں؟ ظاہر بات ہے کہ یہ میرے اختیار میں نہیں ہے کہ میں اکیلا اس کو بدل سکوں۔ لہٰذا اس اجتماعی گناہ کا ازالہ بھی اجتماعی توبہ سے ہوگا۔

اجتماعی توبہ کا طریقہ کار

اجتماعی توبہ کا طریق کار یہ ہے کہ پہلے افراد انفرادی طور پر توبہ کریں اور صحیح توبہ کریں۔ صحیح توبہ یہ ہے کہ ہماری زندگی میں جو حرام شے ہے اسے فوراً نکال باہر کریں۔ اس معاشرے میں رہتے ہوئے ہم اسلامی احکام اور اسلامی تعلیمات پر اپنی امکانی حد تک عمل پیرا ہوں۔ البتہ شریعت کے بعض قانون ہمارے ملک میں رائج نہیں ہیں‘ اس لیے ان پر عمل ممکن نہیں ہے۔ مثلاً ہم کسی زانی کو رجم نہیں کر سکتے‘ کسی چور کا ہاتھ نہیں کاٹ سکتے‘ یہ تو تب ہوگا جب اس کا قانون بنے گا۔ تو بعض ایسے احکامات ہیں جن پر ہم قانوناً عمل نہیں کر سکتے‘ لیکن ان کے علاوہ باقی پوری شریعت پر عمل کیا جا سکتا ہے۔ اب سود کی مثال لے لیجیے کہ میں سود بند نہیں کر سکتا‘ بینکوں کو میں آگ نہیں لگا سکتا اور اگر بالفرض بینکوں کو آگ لگا بھی دیں تب بھی سود ختم نہیں ہوگا۔ لیکن میں یہ تو کر سکتا ہوں کہ براہِ راست سود میں ملوث نہ ہوں‘ سود پر قرضہ لے کر اپنا کاروبار نہ چمکاؤں‘ اپنی دکان نہ اونچی کروں۔ کیونکہ کسی نے یہ قانون نہیں بنایا اور نہ آپ پر لازم کیا ہے کہ آپ سودی قرضہ لیں اور اپنی بلڈنگ عالیشان بنائیں۔ اگر آپ ایسا کر رہے ہیں تو آپ مجرم ہیں۔

اسی طرح ہمارے معاشرے میں ایسا کوئی قانون نہیں بنا کہ پردہ اور برقع حرام ہے۔ ترکی میں تو یہ قانون بنا دیا گیا تھا کہ وہاں سر ڈھانپنا اور سکارف لینا بھی ممنوع ہے‘ لیکن یہاں تو ایسا کوئی قانون نہیں ہے‘ تو پھر یہاں جنہوں نے پردہ چھوڑا ہے وہ خود مجرم ہیں۔ یہاں تو اللہ کا شکر ہے کہ کوئی مصطفیٰ کمال پاشا جیسا آج تک پیدا نہیں ہوا کہ جس نے ان چیزوں کا حکم دیا ہو۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ ذرائع ابلاغ فحاشی اور عریانی کی ترغیب دے کر اسے عروج دے رہے ہیں‘ لیکن اس کے باوجود انتخاب آپ خود کرتے ہیں اور فیصلے کا اختیار بھی آپ کو حاصل ہے۔ اجتماعی توبہ کا پہلا مرحلہ یہ ہے کہ شریعت کے تمام ممکنہ احکامات پر عمل پیرا ہوا جائے اور جن چیزوں سے گناہ میں پڑ جانے کا امکان ہے اس کو عملاً ترک کیا جائے اور تنہائی میں گڑگڑا کر اللہ تعالیٰ سے معافی مانگی جائے۔

اجتماعی توبہ کا دوسرا مرحلہ یہ ہے کہ عزمِ مصمم یعنی پکا ارادہ کر لیا جائے کہ اے اللہ! اب بقیہ زندگی جتنی بھی ہے اس میں اپنی توانائیاں‘ اپنی قوتیں‘ صلاحیتیں سب تیرے دین کی تبلیغ اور تیرے دین کو قائم کرنے کی جدوجہد میں لگا دیں گے۔ ایسا عزمِ مصمم کرنے والے اگر چودہ کروڑ میں سے چودہ لاکھ بھی ہو جائیں (اس لیے کہ دو چار افراد کے توبہ کرنے سے ملک کی قسمت نہیں بدلتی) یعنی معتد بہ تعداد میں اگر ایسے لوگ جمع ہو جائیں اور پھر وہ مل کر زور لگائیں اور منظم ہو کر‘ ایک طاقت بن کر نظام کو بدلنے کی جدوجہد کریں اور پھر اللہ سے دعا کریں تو واقعتاً اس ملک کے اندر شریعت اسلامی کا نفاذ ہو سکتا ہے اور اللہ کا عطا کردہ نظام قائم کیا جا سکتا ہے جس کے لیے یہ ملک بنایا گیا تھا۔

یہاں یہ بات بھی جان لیجیے کہ سو فیصد لوگ کبھی بھی ٹھیک نہیں ہوئے۔ حضور ﷺ کے زمانے میں نہیں ہوئے تو آج کیسے ہو جائیں گے؟ حضور ﷺ کے زمانے میں منافق بھی موجود تھے۔ بمصداقِ قرآنی: ﴿وَمِمَّنْ حَوْلَكُمْ مِّنَ الْاَعْرَابِ مُنٰفِقُوْنَ ۛ وَمِنْ اَهْلِ الْمَدِيْنَةِ ۛ مَرَدُوْا عَلَى النِّفَاقِ ۛ﴾ (التوبة:۱۰۱) ”تمہارے گرد و پیش بدوی ہیں جن میں سے بہت سے منافق ہیں اور اسی طرح خود مدینہ کے باشندوں میں بھی (منافق ہیں) جو نفاق میں طاق ہو گئے ہیں“ —— تو سو فیصد کبھی ٹھیک نہیں ہوتے لیکن کسی

معاشرے کے اندر معتد بہ تعداد میں لوگ پہلے مرحلے میں خود توبہ کر کے' اپنی اصلاح کر کے اور دوسرے مرحلے میں ایک اجتماعی قوت کی شکل اختیار کر کے اس نظام کو بدلنے کے لیے تن مَن دھن لگائیں۔ اب اگر نظام کو واقعی بدل لیں تب تو توبہ قبول ہو گئی' لیکن فرض کیجیے کہ نہیں بھی کامیاب ہوتے تو خود اُن کی نجات ہو جائے گی جو اس کام میں لگ کر اپنا تن من دھن اللہ کے نظام کے نفاذ کے لیے لگا دیں اور ﴿اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۱۶۲﴾﴾ (الانعام) کی عملی شکل بن جائیں۔

اس کی مثال سورۃ الاعراف میں بیان ہوئی ہے۔ یہودیوں کا ایک قبیلہ ساحل سمندر پر آباد تھا۔ یہ مچھیرے تھے جو مچھلیاں پکڑتے اور بیچتے تھے۔ یہود کے لیے قانون تھا کہ ہفتے کے روز کوئی دنیاوی کام کرنا حرام ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہمارے لیے یہ حکم بہت آسان کر دیا ہے کہ جمعہ کی اذان سے لے کر نماز ختم ہو جانے تک کاروبارِ دُنیوی حرام ہے۔ کوئی خالص حلال کاروبار بھی اُس وقت کیا جائے تو وہ حرام ہے' اس کی کمائی حرام ہے' جبکہ اس وقت کے علاوہ باقی تمام اوقات میں دُنیوی کاروبار جائز ہے۔ یہود کی شریعت میں یہ معاملہ بڑا سخت تھا کہ ہفتے کا پورا دن عبادت کے لیے وقف تھا اور اس دن کاروبار وغیرہ بالکل حرام تھا۔ اسی طرح ان کے ہاں روزے کا انداز یہ تھا کہ کھانا پینا بھی نہیں' قضائے شہوت بھی نہیں اور گفتگو بھی نہیں۔ پھر روزے میں سحری نہیں تھی' بس رات کو سو گئے تو روزہ شروع ہو گیا۔ یعنی یہود کی شریعت میں بڑی سختی تھی۔ ہماری شریعت چونکہ بہت بڑے پیمانے پر دنیا میں پھیلنے والی تھی لہٰذا اس میں نرمی رکھی گئی ہے۔ مختلف ملکوں' مختلف مزاجوں اور مختلف پس منظر کے لوگوں نے اس اُمت میں شامل ہونا تھا' ان کو accomodate کرنے کے لیے شریعت میں نرمی رکھی گئی ہے۔ بہرحال اللہ تعالیٰ نے یہودی مچھیروں کا امتحان لیا۔ یہ بھی نوٹ کر لیں کہ جیسے انسان کے اندر شعور ہے اسی طرح حیوانات میں بھی ایک شعور ہے۔ وہ مچھیرے ہفتے کے روز مچھلی نہیں پکڑتے تھے جبکہ باقی چھ دن مچھلیوں کی شامت آئی رہتی تھی۔ مچھلیوں کو بھی اندازہ ہو گیا کہ ہفتے میں ایک دن ایسا ہے کہ اس دن ہمیں یہ کچھ نہیں کہتے۔ لہٰذا چھ دن تو وہ کھلے سمندر میں چلی

جاتیں اور ساحل پر آتی ہی نہیں تھیں جبکہ ساتویں دن' ہفتے کے روز' وہ ساحل کے قریب خوب اٹھکیلیاں کرتیں' پانی میں اچھل کود کرتیں اور یہ بیٹھے دیکھ رہے ہوتے' کیونکہ پکڑ تو سکتے نہیں تھے۔ بالآخر اس آزمائش میں ناکامی ہوئی اور کچھ لوگوں نے اس حکم کو توڑا اور مچھلیاں پکڑنی شروع کر دیں۔ جبکہ کچھ لوگوں نے یہ حیلہ نکالا کہ ان کو پکڑتے تو نہیں تھے' لیکن ایسا کرتے تھے کہ ہفتے کے روز ساحل کے کنارے گڑھے کھود لیتے اور ساحل سے نالیاں بنا کر پانی ان گڑھوں میں لے آتے' اس کے ساتھ مچھلیاں بھی آ جاتیں۔ پھر وہ راستہ بند کر دیتے تاکہ مچھلیاں واپس نہ جا سکیں اور اتوار کو جا کر ان کو پکڑ لیتے۔ اس حیلہ سے بھی شریعت کا حکم تو ختم ہو گیا نا! شریعت کا حکم تو اس لیے تھا کہ ہفتہ کے روز دنیاوی کاروبار نہ کرو بلکہ اللہ کو یاد کرو' ذکر کرو' نوافل ادا کرو' جو کتاب اللہ تورات کی صورت میں تمہارے پاس ہے اس کا مطالعہ کرو' اس کی تلاوت کرو' لیکن تم نے وہ دن تو اسی دنیاوی دھندے میں لگا دیا۔

اس پر قوم تین حصوں میں تقسیم ہو گئی: (i) جو یہ کام عملاً کر رہے تھے' چاہے براہِ راست کر رہے تھے یا نالیاں بنا کر۔ (ii) جو کر تو نہیں رہے تھے' لیکن کرنے والوں کو روکتے بھی نہیں تھے۔ (iii) جو خود بھی بچے ہوئے تھے اور دوسروں کو روک بھی رہے تھے کہ خدا کے بندو! باز آ جاؤ' اللہ کے غضب کو دعوت مت دو۔ ان تین میں سے اللہ تعالیٰ نے تیسرے گروہ کو نجات دی' جو خود بھی بچے ہوئے تھے اور دوسروں کو روکتے بھی تھے۔ فرمایا:

﴿فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖۤ اَنْجَیْنَا الَّذِیْنَ یَنْهَوْنَ عَنِ السُّوْٓءِ وَاَخَذْنَا الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا بِعَذَابٍۭ بَىِٕیْسٍۭ بِمَا كَانُوْا یَفْسُقُوْنَ ﴿۱۶۵﴾﴾ (الاعراف)

''پھر جب وہ بھول گئے جو ان کو سمجھایا گیا تھا تو نجات دی ہم نے ان کو جو برائی سے منع کرتے تھے اور پکڑا ان کو جنہوں نے ظلم کیا برے عذاب میں بسبب ان کی نافرمانی کے۔''

اسی طرح اگر ہماری اجتماعی توبہ کی جدوجہد اس درجے تک نہ پہنچ پائے کہ نظام بدل جائے' پھر بھی اس کا فائدہ جدوجہد کرنے والوں کی اپنی نجات کی صورت میں

تو ہوگا۔ فرض کیجیے کہ قوم کا معاملہ اس درجے تک آ گیا ہو کہ اب شامتِ اعمال آنی ہی آنی ہے‘ لیکن ہم اپنی سی کوشش کرتے ہیں تو چاہے انقلاب نہ آ سکے‘ ہم دین کو قائم نہ کر سکیں‘ منکرات کو ختم نہ کر سکیں‘ لیکن اگر ہم آخری دم تک یہ کام کرتے رہیں گے تو ہم اللہ کے ہاں نجات پا جائیں گے‘ ہماری اللہ تعالیٰ کے ہاں مغفرت ہو جائے گی۔ یہ ہے اجتماعی توبہ اور اس کا طریقہ کار۔

توبہ میں دعا کی اہمیت

اجتماعی توبہ کا یہ طریقہ کار میں کئی بار تفصیل سے بیان کر چکا ہوں‘ لیکن ایک بات کی طرف میرا ذہن حال ہی میں منتقل ہوا ہے۔ وہ یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ سے خلوصِ دل کے ساتھ دعا کریں گے تو اللہ کے نظام کے نفاذ کے لیے جدوجہد کرنے والوں کی دعا ضرور قبول ہو گی۔ دعا بہت بڑی شے ہے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ((اَلدُّعَاءُ مُخُّ الْعِبَادَةِ))(۱) ”دعا عبادت کا مغز ہے“۔ دوسری حدیث میں فرمایا: ((اَلدُّعَاءُ ھُوَ الْعِبَادَةُ))(۲) ”دعا ہی عبادت ہے“۔ اجتماعی توبہ کا جو منہج میں بیان کرتا ہوں‘ اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ تو بڑا لمبا راستہ ہے کہ کم از کم دو تین لاکھ انسان صحیح معنی میں توبہ کریں‘ پھر وہ ایک طاقت بنیں اور تن من دھن لگانے اور اپنی جانیں دینے کے لیے تیار ہو جائیں۔ یہ کافی لمبا راستہ لگتا ہے ؏ دراز و دور دیدم رہ و رسم پارسائی — اس پر میرا ذہن منتقل ہوا ہے دعا کی طرف۔ فرمانِ باری تعالیٰ ہے: ﴿اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ﴾ (البقرۃ:۱۸۶) ”میں ہر پکارنے والے کی پکار کا جواب دیتا ہوں جب بھی مجھے پکارے“۔ دوسری جگہ فرمایا: ﴿اَمَّنْ یُّجِیْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ﴾ (النمل:۶۲) ”بھلا وہ کون ہے جو کسی مضطر کی پکار کا جواب دیتا ہے“۔ مضطر کہتے ہیں نہایت پریشان حال کو۔ جب ایک مضطر اور پریشان حال اللہ کو پکارے کہ اے اللہ! کسی اور طرف سے مجھے کوئی توقع نہیں رہی‘ کوئی ایسا نہیں رہا جس سے مجھے کوئی امید ہو تو اے پروردگار! تو میری دستگیری فرما۔ یہ مضطر جب اضطرار کی حالت میں بالکل بے چین ہو کر اللہ تعالیٰ کو پکارتا

(۱) سنن الترمذی‘ کتاب الدعوات عن رسول اللہ ﷺ۔ (۲) ایضاً۔

ہے تو وہ اس کی دعا کو قبول کرتا ہے۔ دعا کے بارے میں تو یہاں تک الفاظ آتے ہیں: ((لَا یَرُدُّ الْقَضَاءَ اِلَّا الدُّعَاءُ))(۱) ”قضا کو کوئی شے نہیں بدل سکتی سوائے دعا کے“۔ تقدیرِ الٰہی کو بھی اسی لیے دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے: (۱) تقدیرِ مبرم یعنی اللہ کا وہ فیصلہ ہے جو کسی صورت میں ٹل نہیں سکتا۔ (۲) تقدیرِ معلّق: یہ بھی اللہ کا فیصلہ ہوتا لیکن اس میں تبدیلی ہو سکتی ہے اور اس تقدیرِ معلّق میں دُعا انتہائی مؤثر شے ہے۔ دُعا کی قبولیت کے لیے شرط وہی ہے کہ پہلے خلوص نیت سے اجتماعی توبہ کریں اور پھر دینِ الٰہی کی تبلیغ اور اللہ کے نظام کو قائم کرنے کے لیے اپنا سب کچھ قربان کرنے کے لیے تیار ہو جائیں اور حرام سے اپنے وجود اور اپنے گھر کو پاک کریں۔ اس کے بغیر دعا کی قبولیت ممکن نہیں ‘ جیسا کہ سورۃ المائدۃ میں فرمایا گیا: ﴿قُلْ یٰۤاَھْلَ الْکِتٰبِ لَسْتُمْ عَلٰی شَیْءٍ حَتّٰی تُقِیْمُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِیْلَ وَمَاۤ اُنْزِلَ اِلَیْکُمْ مِّنْ رَّبِّکُمْ ؕ﴾ (آیت ۶۸) ”(اے نبی ﷺ! ان سے) کہیے‘ اے اہلِ کتاب تمہاری کوئی حیثیت نہیں اللہ کی نگاہوں میں (یعنی تمہاری کوئی دعا اللہ کے ہاں قابل پذیرائی نہیں ہے) جب تک کہ تم قائم نہیں کرتے تورات اور انجیل کو اور جو کچھ بھی تم پر نازل کیا گیا تمہارے ربّ کی طرف سے“۔ اسی کی کمی ہے‘ ورنہ ہم دیکھتے ہیں کہ تیس تیس لاکھ آدمی حج کے موقع پر کیسی کیسی دعائیں مانگتے ہیں‘ لیکن ان دعاؤں کی قبولیت کے آثار ہمیں نظر نہیں آتے۔ آثار تب نظر آئیں گے جب خالص اور صحیح معنوں میں توبہ ہو گی۔

(جاری ہے)

(۱) سنن الترمذی‘ کتاب القدر عن رسول اللہ ﷺ‘ باب ما جاء لا یرد القدر الا الدعاء۔

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث نبوی ؐ آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور دعوت و تبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

میں نے اپنے استادِ مکرّم سے کیا سیکھا

شاہدہ شوکت ظفر

کسی ایسی شخصیت کے بارے میں اظہارِ خیال خاصا مشکل کام ہے جس سے براہِ راست آپ کا واسطہ نہ پڑتا ہو' لیکن میری خوش نصیبی ہے کہ میں نے بلاواسطہ بھی اپنے استاد سے بہت کچھ سیکھا۔ جو کچھ بھی سیکھا اس کا ذکر کرنا بہت ضروری ہے' کیونکہ اگر ایسا نہ کیا گیا تو پتا کیسے چلے گا کہ یہ کتاب اپنے قابلِ احترام استاد کے نام کیوں کی گئی!

۱۹۷۸ء میں ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کا ''الہدیٰ'' نامی ہفتہ وار پروگرام پی ٹی وی پر نشر ہوتا تھا جسے ہم سب گھر والے بڑے شوق سے دیکھتے تھے۔ میں اپنے سارے گھریلو کام اسی پروگرام کے ٹائم کے مطابق ترتیب دے لیتی تھی تاکہ پروگرام دیکھ سکوں۔ شاید یہ سب سے پہلا تعلق تھا جو ڈاکٹر صاحب سے بنا۔ پھر چند نامعلوم وجوہات کی بنا پر پروگرام بند کر دیا گیا' لیکن آڈیو کیسٹس کے ذریعے وقفے وقفے سے یہ تعلق جاری رہا۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے مجھے چار پیارے پیارے بچوں سے نوازا جن کی پیدائش اور پرورش کی وجہ سے یہ تعلق کچھ خاص مضبوطی اختیار نہ کر سکا۔ مجھے اچھی طرح تو یاد نہیں' غالباً ۱۹۸۹ء میں پہلی بار ڈاکٹر صاحب مہمان کی حیثیت سے ہمارے گھر تشریف لائے تھے۔ اس وقت ڈرتے ڈرتے بمشکل ایک آدھ ملاقات ہو پائی۔ خواتین کے لیے ڈاکٹر صاحب کے دروس گھر پر ہوتے رہے' جو ایک خاص سیٹنگ (setting) کے ساتھ کیے جاتے تھے کہ خواتین اور ڈاکٹر صاحب کے درمیان ایک بلائنڈ کھڑی کر دی جاتی۔ مہینوں میں کبھی ایک بار وہ اسلام آباد تشریف لاتے تھے۔ البتہ لاہور کے لارنس گارڈن میں دیا گیا تقریباً ہر خطابِ جمعہ کیسٹ کی شکل میں ڈاک کے ذریعے میرے پاس پہنچ جاتا تھا' جسے میں سن لیا کرتی تھی۔ میری زندگی میں سب سے زیادہ تبدیلی کا باعث ڈاکٹر صاحب کا مرتّب کردہ مطالعہ قرآن حکیم کا منتخب نصاب تھا۔ یہ اب سی ڈی کی شکل میں

دستیاب ہے' لیکن اس وقت کیسٹوں کی صورت میں تھا جسے میں سنتی تھی' لکھتی تھی اور پھر پڑھاتی تھی۔ ایسا کرنا نہ صرف میرے اندر انقلابی تبدیلی لایا بلکہ جس کو بھی پڑھایا اس میں تبدیلی کا باعث بھی بنا۔

۱۹۹۱ء میں اپنی فیملی کے ساتھ سیر و سیاحت کا ایک طویل پروگرام ترتیب دیا جو لندن سے شروع ہوا اور ناروے کے سرحدی شہر ناروک پر ختم ہوا۔ تقریباً چھ ماہ کا عرصہ ''سِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ ''یعنی ''دنیا میں نگاہِ عبرت سے گھومو پھرو'' کی قرآنی ہدایت کے امتثال میں گزارا۔ اس سفر کے دوران جہازوں' بسوں اور خاص طور پر ٹرینوں میں ایک خاصا لمبا وقت مل جاتا تھا جس میں مسلسل سوچ بچار کا سلسلہ جاری رہا۔ مظاہر قدرت اور انسان کی مادی ترقی ہر قدم پر میرے دماغ کو جھنجھوڑ رہی تھی کہ: ہم کون ہیں؟ کہاں سے آئے ہیں؟ ہمارا انجام کیا ہوگا؟

اس سفر پر جانے سے تقریباً آٹھ سال پہلے میں نے پردہ شروع کر دیا تھا۔ سفر یورریل کا تھا۔ میں نے عبا اور سکارف کے ساتھ سفر کیا۔ میرے محترم شوہر داڑھی رکھ چکے تھے جبکہ ایک teen-ager بیٹی سکارف کے ساتھ اور اس سے چھوٹے تین بیٹے میرے ہمراہ تھے۔ اس طرح کی ایک مسلمان فیملی کا ایسا سفر بذاتِ خود ایک انوکھا اور دلچسپ تجربہ تھا لیکن اس کے ساتھ تکلیف دہ بھی تھا۔ لوگ ہماری طرف ایسے دیکھتے تھے جیسے ہم کسی اور ہی سیارے کی مخلوق ہوں' خاص طور پر سبز پاسپورٹ دیکھ کر تو بہت توہین آمیز سلوک کرتے۔ ہمیں بچوں کو اس غلاظت سے چھپانے کی سخت مشقّت درپیش تھی جس کا اظہار وہ بسوں' ٹرینوں' سب ویز' برقی زینوں (escalators) پر بھی کرنے سے نہیں چوکتے۔ جنسی بے راہ روی کے اس کھلے عام مظاہرے کو وہ انسانی حقوق اور شخصی آزادی کا نام دیتے ہیں۔

اس پر مستزاد یہ کہ انسانوں' ملکوں' شہروں اور تہذیبوں میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ کسی کے پاس اتنا ہے کہ سنبھالا نہیں جا رہا اور کوئی ایک وقت کے کھانے کے لیے ترس رہا ہے۔ ترسے ہوئے لوگوں کو اتنا کم کیوں دیا گیا ہے؟ ان کے ساتھ انصاف کب ہوگا؟ بگڑے ہوئے ترقی یافتہ لوگوں کا انجام کیا ہے؟ شہروں اور ملکوں کی غیر معمولی ترقی دل میں کیسے کیسے لالچ پیدا نہیں کر رہی تھی' البتہ کچھ سوالات تھے جن کے جواب کسی عالم ہی سے پوچھے جا سکتے تھے تاکہ تسلّی وتشفّی ہو سکے۔ کرنا رحمٰن کا کیا ہوا کہ جب سفر سے واپسی ہوئی تو پتا چلا کہ ڈاکٹر صاحب ہمارے گھر تشریف لا رہے ہیں۔ دل نے کہا ''وہ مارا'' کہ سارے راستے انہی کے بارے میں سوچا

تھا ـــــــ اتنے بڑے عالم جنہوں نے سمع وطاعت کی بنیاد پر ایک جماعت بنائی ہے جو تعلیم کے ساتھ ساتھ تربیت بھی کرتی ہے۔ ایسا لگا جیسے میری دعا کا جواب موصول ہو رہا ہے!

جماعت میں شمولیت اختیار کرنے کے لیے شرح صدر اسکاٹ لینڈ جاتے ہوئے ٹرین کے سفر کے دوران ہی ہو گیا تھا۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ مجھے واپس جا کر کسی جماعت میں شمولیت اختیار کر لینی ہے' لیکن میرے پاس مختلف جماعتوں کے بارے میں کوئی خاص معلومات نہیں تھیں کہ میں بذاتِ خود تقابلی جائزہ لے سکتی کہ کون سی جماعت میرے لیے درست ہے۔ سو صرف دعا کرتی رہی کہ ''یا اللہ! اگر ڈاکٹر صاحب صحیح راستے پر ہیں اور میرا ان کی جماعت میں شامل ہونا سود مند ہے تو مجھے واپسی کے ساتھ ہی بیعت کرنا نصیب فرما''۔

بیعت فارم fill کر کے بھیجا تو مطالبہ کیا گیا کہ تنظیم اسلامی میں شامل ہونے کے لیے خواتین کو لازمی شرعی پردہ کرنا پڑے گا۔ چنانچہ کر لیا گیا۔ سورۃ الممتحنۃ اس فارم کی بنیاد ہے۔ اس کے ساتھ دیگر برائیوں سے چھٹکارہ حاصل کرنے کی جدّوجہد بھی شروع کر دی گئی' جو تا حال جاری ہے۔

سفر سے واپس آتے ہی جب ڈاکٹر صاحب کے آنے کی خوشخبری ملی تو دل باغ باغ ہو گیا' ایسے لگا کہ یہ سب رحمت ایزدی کا کمال ہے۔ سفر کے دوران جو بھی سوال ذہن میں جمع ہوئے تھے وہ سب پوچھ ڈالے تھے۔ ان میں سے ایک بڑا ہی اہم سوال یہ تھا: یہ جو یورپ اور امریکہ میں اتنی ترقی ہے' اگر ہماری ساری پاکستانی قوم اس بات میں جت جائے کہ دن رات ایک کر دے پھر بھی ہم اتنی ترقی نہ کر سکیں گے۔ ترقی نہیں کریں گے تو ان اقوام کا مقابلہ کیسے کریں گے؟ اگر مقابلہ ہو بھی گیا تو ہار یقینی ہے۔ اور کیا یہ زیادتی نہیں کہ ہم مسلمانوں کو کفار کے مقابلے میں کم دیا گیا ہے جبکہ اللہ تعالیٰ ان سے خوش بھی نہیں ہیں؟ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کر کے وہ ان حالات میں اس کو ناراض بھی کرتے ہیں!

مجھے محسوس ہوتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب میرے جذبات واحساسات کو پا گئے تھے' سو انہوں نے میری کیفیت کو مدِّنظر رکھتے ہوئے یہ جواب دیا: ''محترمہ آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں' ہم واقعی اس درجے کی ترقی نہیں کر سکتے چاہے کتنی بھی محنت کر لیں۔ رہ گئی مقابلے کی بات' تو ان ہتھیاروں اور ایسے لوگوں کا مقابلہ کرنے کے لیے تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام دوبارہ اس دنیا میں آئیں گے (جب بھی وہ نگاہ اٹھائیں گے تو اس میں سے شعائیں نکلیں گی جس سے ہر چیز پگھلتی چلی

جائے گی)۔ رہ گئی مادی ترقی کی بات تو رسول صادق ﷺ فرما گئے ہیں کہ ان کے لیے دنیا ہے تمہارے لیے آخرت۔ یعنی ہم نے صرف دنیا کو مقصود نہیں بنانا بلکہ آخرت ہمارا مقصود ہے۔ دنیا اور اس کی زینت اور مادی ترقی یہ سب دنیا میں برتنے کے لیے ہے' لیکن دنیا کو چھوڑنا بھی نہیں' حالانکہ ایسا کرنا آسان ہے' بلکہ دنیا میں رہتے ہوئے ربّ رحیم وکریم کے امتحان کو پاس کرنا ہے۔ ان چیزوں کو برتنے کے لیے بنایا گیا ہے۔ یہ عارضی استعمال کی چیزیں (متاع الدنیا) ہیں۔''

اس جواب کے بعد میرے دل میں خیال آیا کہ بطور مسلمان ہمیں ہاکی کے ایک کھلاڑی کی طرح اکیس کھلاڑیوں سے گیند بچا کر اپنا گول کر جانا ہے' ان شاء اللہ!

میرا دوسرا سوال تھا: ڈاکٹر صاحب! کوئی عالم دین ہو یا مولوی حضرات یا پھر کوئی بھی مروّجہ روایتی درس دینے والے' سب لوگ ڈراتے ہیں کہ اللہ سب سے بڑا ہے۔ کیا ہم جب نماز پڑھیں تو ڈرتے رہیں؟ اس سے نماز میں لطف نہیں آتا۔ کیا میرا یہ خیال غلط ہے کہ ہمیں ربّ تعالیٰ سے محبّت بھی کرنی چاہیے؟ وہ ہمارا خالق ومالک ہے' اس نے ہمیں پیدا کیا ہے۔ وہ ہم سے محبت کرتا ہے۔ ڈر کے ساتھ اگر محبت کا جذبہ بھی غالب ہو تو کیا یہ کوئی گناہ یا گستاخی کی بات تو نہیں؟ ایسے پڑھی گئی نماز کیسی رہے گی؟

ڈاکٹر صاحب نے جھٹ جواب دیا: محترمہ! اگر آپ کو اس کیفیت میں ایک رکعت' آدھ رکعت یا اس سے بھی کم ملے تو لے لینا لیکن اپنی اس بات پر قائم رہنا' اسے چھوڑنا نہیں!

بعد میں میرے محترم شوہر نے بتایا کہ ڈاکٹر صاحب ان سے کہہ رہے تھے اس کے خیالات بہت اعلیٰ ہیں۔ اس بات سے میری ڈھارس بندھی۔

ابتدا میں ایک شخص ٹامک ٹوئیاں مار رہا ہوتا ہے' ابھی ٹھیک طرح اس کا تعارف اپنے رب سے نہیں ہوا ہوتا۔ اس مرحلے پر اگر کوئی ایسا استاد میسر آ جائے جو انگلی پکڑ کر اس شاہراہ پر چڑھا دے جس پر چڑھنے کی ابھی مبتدی کو سمجھ بھی نہیں ہے تو غیر محسوس طریقہ سے اس کی بڑی مدد ہو جاتی ہے۔

جو چیز مجھے ڈاکٹر صاحب سے رشک میں مبتلا کرتی تھی وہ ان کا دین کی خاطر طویل سفر کرنا ہے۔ کوئی کام نہیں' کوئی سیر نہیں' بلکہ صرف لیکچر دینے کے لیے بلند وبالا پہاڑوں پر مشکل اور طویل سفر بھی بیماری اور کمزوری کے باوجود کیے جا رہے ہیں۔ ایک لگن اور چوٹ سی لگی ہے

جو چین نہیں لینے دیتی!

ایک دفعہ اتفاق سے اس وین کا اندرونی حصہ دیکھنے کا اتفاق ہوا جس میں ڈاکٹر صاحب سفر کرتے تھے‘ تو بڑی حیرت ہوئی۔ لوہے کا بیڈ بنا کر ویلڈ کیا گیا تھا جس پر بستر لگا تھا۔ بتایا گیا کہ صحت کی خرابی کی وجہ سے اب طویل وقت بیٹھ نہیں سکتے‘ اس بستر پر لیٹ کر سفر کرتے ہیں۔ ایک ہم ہیں کہ عام طور پر اپنی بیماریوں اور تکلیفوں کا رونا لے کر بیٹھ جاتے ہیں۔ اس بات نے دین کے لیے کام کرنے کی ایک انوکھی لگن پیدا کی۔ اور یہ حقیقت تو ڈاکٹر صاحب کی کیسٹس سے بھی مجھ پر عیاں ہوئی کہ محمد ﷺ کا دین پھیلانے کا مشن ابھی پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچا‘ یہاں تک کہ پورے کرۂ ارضی پر اسلام پھیل جائے اور ربّ کا نظام قائم ہو جائے۔ بالفاظِ قرآنی:

﴿يُرِيْدُوْنَ لِيُطْفِـُٔوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَاللّٰهُ مُتِمُّ نُوْرِهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ ⑧ هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ⑨﴾ (الصف)

”وہ چاہتے ہیں کہ اللہ کا نور (دین اسلام) اپنے منہ سے بجھا دیں جبکہ اللہ اپنا نور پورا کرنے والا ہے اگرچہ کافر ناپسند ہی کریں۔ وہی ہے جس نے اپنا رسول ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا تاکہ وہ اسے تمام دینوں پر غالب کر دے اگرچہ مشرک ناپسند ہی کریں۔“

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْٓا اَنْصَارَ اللّٰهِ كَمَا قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ لِلْحَوَارِيّٖنَ مَنْ اَنْصَارِيْٓ اِلَى اللّٰهِ ۭ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ﴾ (الصف:١٤)

”اے ایمان والو! تم اللہ کے مددگار ہو جاؤ جیسے عیسیٰ ابن مریم نے حواریوں سے کہا تھا: اللہ کی راہ میں میرا مددگار کون ہے؟ حواریوں نے کہا: ہم اللہ کے مددگار ہیں۔“

بالواسطہ یہ ہم سے کہا جا رہا ہے۔ جیسے عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے حواریوں سے سوال کیا‘ یہی سوال محمد (ﷺ) کر رہے ہیں کہ اے میرے اُمّتیو! میرا مشن ابھی مکمل نہیں ہوا۔ کون ہے اس مشن کو مکمل کرنے میں میرا مددگار؟ کیسٹس سن کر لوہا گرم تھا‘ تو بے اختیار منہ سے نکلا: ہم ہیں آج بھی آپؐ کے مددگار‘ آپؐ کے دست و بازو اس دین کو پھیلانے میں۔

اس کے لیے سب سے پہلے اس دین حق کو اپنی ذات پر لاگو کرنا تھا۔ اور یہ کام کرنے کے لیے ڈاکٹر صاحب کے دروس اور کیسٹس سن کر ایک لفظ سمجھ میں آیا تھا: through

proper channel یعنی قرآن وسنت سے وہی طریقہ مبارک جو رسول کریم ﷺ نے اختیار کیا تھا‘ کوئی دوسرا طریقہ نہیں۔ تو سوال ذہن میں اُبھرا: اِس کے لیے کیا طریقہ اختیار کروں؟ کیا صرف مسواک کرلوں یا زمین پر بیٹھ کر کھانا کھالوں‘ زمین پر بوریے کے بستر پر سو جاؤں یا نماز تہجّد پڑھ لوں (مستقل)‘ نوافل میں کھو جاؤں اور ایسا کھوؤں کہ فرائض کو پس پشت ڈال دوں! حمد و نعت سنوں‘ روؤں‘ مکہ معظّمہ اور مدینہ منوّرہ کے تاج پر آنسو بہاؤں۔ ٹی وی پر ہر مذہبی پروگرام بڑے ذوق وشوق سے دیکھوں۔ بے حساب درس اٹینڈ کروں اور خود بھی درس دوں جس سے درس کا نشہ چڑھ جائے اور سننے والا یہ کہے کہ ”کیا خوبصورت درس تھا! آواز بھی پیاری تھی اور خود بھی خوبصورت تھیں“۔ زکوٰۃ ادا کروں‘ ہو سکے تو صدقہ وخیرات بھی کروں۔ نمازیں فرض اور نوافل دونوں بڑے اہتمام کے ساتھ پڑھوں۔ روزے پچھلے چھٹے ہوئے بھی پورے کرلوں۔ پہلے حج کروں فرض اور پھر نفلی‘ ہر سال عمرے پر بھی چلی جاؤں۔ حج اور عمروں کی تعداد بے شمار ہو جائے۔ خوشی بھی ہوتی ہے اور لوگوں پر رعب بھی بیٹھتا ہے کہ اتنے عمرے کیے ہوئے ہیں! عام خیال کے مطابق میرا بھی یہی خیال تھا کہ ہم کون سے برے کام کرتے ہیں۔ نہ چوری نہ ڈاکہ‘ عام سیدھی سادی شریفانہ زندگی گزار رہے ہیں۔ گناہ گار تو دوسری قسم کے لوگ ہوتے ہوں گے جن کو قرآن حکیم يٰٓاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ کہہ کر مخاطب کرتا ہے۔ اپنی طرف تو خیال جاتا ہی نہیں‘ جبکہ ہم مسلمانوں کی اکثریت فاسقین (نافرمان) اور منافقین کی ہے۔ تو ڈاکٹر صاحب کی کیسٹس کے ذریعے پتا چلا کہ مکمل مسلمان ہونے کے لیے پوری کی پوری زندگی یعنی چوبیس گھنٹے ہمہ تن‘ ہمہ وقت‘ ہمہ جہت اللہ تعالیٰ کی بندگی اختیار کرنی ہے۔ اس کے لیے قرآن وسنت پر مکمل عمل درکار ہے۔ اگرچہ اوپر بیان کیا گیا طریقہ بھی غلط نہیں لیکن اس کے اختیار کرنے سے ہم جزوی مسلمان کہلائیں گے‘ مکمل اسلام میں داخل نہیں ہوں گے۔

پانچ وقت نماز پڑھنے والے اس بات کا بیسیوں بار اقرار کرتے ہیں کہ اِيَّاكَ نَعْبُدُ (ہم صرف تیری ہی عبادت کرتے ہیں)‘ لیکن ایمان داری سے دیکھا جائے تو سب سے زیادہ اپنے نفس ہی کی پوجا پاٹ کرتے ہیں۔ اسی کی مانتے ہیں‘ اسی کو خوش کرتے ہیں‘ اسی کو ممدوح سمجھتے ہیں‘ جبکہ عبد تو کہتے ہیں غلام اور لونڈی کو جس کی اپنی کوئی مرضی نہیں ہوتی۔ وہ سارے کا سارا اپنے رب کا بندہ یا بندی ہوتی ہے اور صرف اسی کی مرضی کا اتباع کرتا/ کرتی ہے۔ مکمل مسلمان بننے کے لیے دین میں پورے کے پورے داخل ہونا ہوگا۔ اس کے لیے:

سونا جاگنا: سنّت کے مطابق ہو۔

کمانا: حلال جس میں سود‘ رشوت کی آمیزش نہ ہو۔

گھرداری: کام پُرخلوص اور اللہ کے لیے‘ خیانت سے پرہیز۔

کلچر‘ رہن سہن: مسلم لائف سٹائل‘ ہندو اور گورے کا نہیں۔

ملاقات: بطور مہمان ٹھہرنے اور میزبانی کے آداب سنتِ کریمہؐ سے۔

تبلیغ: نبی ﷺ کا طریقہ بہت ضروری ہے۔

شادی: ہندو اور گورے کا طریقہ نہیں بلکہ سنتِ نبویؐ کے مطابق نکاح۔

پیدائش: بچے کا عقیقہ‘ اذان‘ تحنیک‘ نام رکھنا وغیرہ۔

موت: میّت کا غسل‘ جنازہ‘ قبرستان کے آداب وغیرہ۔

جنگیں: پورے کا پورا طریقہ آداب کے ساتھ موجود ہے۔

امن: مسلمان کا طریقہ۔

سیر و سیاحت: اسلام میں تفریح کے آداب موجود ہیں۔

دوستی اور دشمنی: صرف اللہ کی خاطر۔ نبی ﷺ نے کبھی ذاتی انتقام نہیں لیا۔

عدل و انصاف: اسلامی قوانین اور جزا و سزا کے مطابق۔

سیاست: جمہوریت نہیں‘ عقل مند لوگوں (اُولی الالباب) کا چناؤ جو دین کی بھی پوری سمجھ رکھتے ہوں۔

طرزِ حکومت: خلافت۔

معیشت: بینک کاری سودی نظام سے پاک‘ ذرائع آمدن رشوت سے پاک۔

رعایا: عوام مکمل مسلمان‘ مؤمن۔

حکمران: رعایا کے ساتھ سنّتِ رسول کریم ﷺ کے مطابق سلوک۔

غرض یہ کہ سب کا سب اسلام کے مطابق ہونا چاہیے۔ ہم عموماً تضادات کا شکار ہیں۔ ایک طرف ہندوؤں کو برا بھلا کہتے ہیں کہ وہ مشرک اور بُت پرست ہیں‘ لیکن اپنا دین پس پشت ڈال کر ان کی تہذیب اور ان کا رنگین کلچر ہم سینے سے لگائے ہوئے ہیں۔ دوسری طرف انگریزوں کو ہم اتنا برا سمجھتے ہیں کہ جس وقت چاہتے ہیں بلا جھجک ان کی تہذیب کے نقائص منہ بھر بھر کر بتاتے ہماری زبان نہیں تھکتی‘ لیکن ان کی نوّے سالہ غلامی کے احساس سے اپنے ذہن کو آج تک آزاد نہیں کر سکے۔ شعوری اور لاشعوری دونوں سطحوں پر ان کی تہذیب‘ ان کی زبان

ہمارا اسٹیٹس سمبل ہے۔ اگرچہ میری جنریشن نے انگریزوں کے سوسالہ غلامی کے دور کو نہیں پایا‘ کیونکہ ہم قیامِ پاکستان کے بعد پیدا ہونے والی نسل ہیں‘ لیکن ہمارے بزرگوں نے غلامی کے دور میں وقت گزارا تھا۔ ایسا لگتا ہے ہمارے پیدائشی نطفے میں ابھی تک غلامی کا احساس ختم نہیں ہوسکا اور اتنا عرصہ گزر جانے کے باوجود بھی ہم ذہنی طور پر آزاد نہیں ہوئے۔

ڈاکٹر صاحب نے ہمیں بتایا کہ ہمارا شادی بیاہ کا سسٹم ’’اُمّ الخبائث‘‘ ہے‘ جس کے بطن سے بڑی بڑی بیماریاں جنم لیتی ہیں۔ اس کو سنّت نبویؐ کے مطابق کر لو اگر دین کے لیے کچھ کرنے کا ارادہ ہے۔ سو علم حاصل کیا گیا۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی شادی کے طریقے کو اپنے عمل کی بنیاد بنایا گیا اور الحمد للہ چاروں بچوں کی شادیاں سنّت نبویؐ[1] کے مطابق کرنے کی بھرپور کوشش کی۔

دل تو پہلے ہی کڑھتا تھا معاشرے کی بدحالی دیکھ کر کہ کیسی کیسی جوانیاں‘ سیرت و کردار کی تمام خوبیاں رکھنے کے باوجود‘ سر میں سفید بال سجا رہی ہیں‘ محض اس لیے کہ ان کے پاس جہیز نہیں اور ان کے والدین ہفتہ بھر کی شادی کے اخراجات اٹھانے کے متحمل نہیں۔ یہ بات دل کو لگی کہ چونکہ موجودہ دور میں جبکہ اسلام اجنبی ہوگیا ہے ایک سنت کو جگانے کا ثواب سو شہیدوں کے خون کے برابر ہے‘ سو کر گزرو کہ جنت قربانی مانگتی ہے۔ محبت چاہے مولیٰ کریم سے ہو یا رسولِ خدا ﷺ سے‘ محبت کی تکمیل قربانی کے بغیر ممکن ہی نہیں۔ کوئی بھی لوک داستان جان دیے بغیر دوام حاصل نہیں کر پائی۔ سو بات سمجھ میں آ گئی اور سب بچوں کی شادیاں سنت کے مطابق کر دیں۔ اپنے ربّ کی غیر معمولی رحمتوں‘ برکتوں اور مہربانیوں کا مزہ چکھا۔

اگلا مطالبہ یہ تھا کہ موت کی رسومات بھی سنّت کریمی کے مطابق ہونی چاہئیں‘ کیونکہ موجودہ طور طریقے ہندو اور گورے سے مستعار لیے گئے ہیں۔ تیجا‘ ساتواں‘ دسواں‘ چالیسواں ہندوؤں سے‘ جبکہ پھولوں کی چادر چڑھانا‘ مزار پر بگل بجانا (حالانکہ قبروں پر سے گزرتے ہوئے سلام کہنا اور بخشش کی دعا مانگنا چاہیے نہ کہ بگل بجانا) وغیرہ گوروں سے مستعار لیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ کئی قسم کے ختم اور وظیفے جو انسانوں نے خود ہی بنا لیے ہیں مُردے کو بخشنے کے لیے۔ ان سب غیر مسنون رواجوں اور رسومات کی جگہ بھی مسنون طریقہ رائج کرنے کی ضرورت تھی۔ جب ڈاکٹر صاحب کی والدہ محترمہ کی وفات ہوئی تو بتایا گیا کہ تنظیم اسلامی کے

(۱) مصنفہ کی کتاب ’’سنّت نبویؐ کے مطابق شادی بیاہ‘‘ میں مکمل تفصیل مہیا کی گئی ہے۔

استقبالیہ آفس میں رجسٹر رکھ دیا گیا ہے‘ آنے والے اس میں اپنے نام کا اندراج کر لیں۔

استقبالیہ کی دیوار پر یہ نوٹس بھی لکھ کر لگا دیا گیا کہ تین دن تک تعزیت کر سکتے ہیں‘ تین دن کے بعد آنے کی تکلیف مت کریں۔ حکم تو یہی ہے کہ تین دن کے بعد جلد از جلد اپنے معمولاتِ زندگی کو معمول پر لے آؤ۔ کسی کی موت سے جو خلا پیدا ہوتا ہے اس کی جگہ تو کوئی نہیں لے سکتا‘ لیکن زیادہ عرصہ تک کے لیے سوگ کی کیفیت کو ناپسندیدہ قرار دیا گیا ہے۔ وقت بہت بڑا مرہم ہے!

بچے کی پیدائش کے وقت بھی اللہ سبحانہ وتعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے احکام کو سب سے بالاتر رکھنا ہے۔ نعمت ملنے پر آپے سے باہر ہو کر اللہ کے دیے ہوئے مال کو بے مقصد جگہوں پر خرچ کر کے خوشی نہیں منانا۔ لڑکے کی پیدائش پر یوں بے خود ہو جاتے ہیں جیسے برائی کا سرٹیفکیٹ مل گیا ہو۔ لڑکی کی پیدائش پر کفارِ مکہ کی طرح چہروں پر تاریکی چھا جاتی ہے۔ ایک دوسرے کو مبارک کے الفاظ تک بھی نہیں کہتے بلکہ جانی پہچانی بات ہے کہ لڑکی ہونے پر مبارک دو تو عموماً لوگ بُرا منا جاتے ہیں۔ لڑکا اگر نعمت ہے تو لڑکی اللہ کی رحمت لے کر گھر میں آتی ہے اور ماں باپ کو جنت میں لے جانے کا سبب بن جائے گی۔

ڈاکٹر صاحب بچوں سے بھی بہت پیار کرتے ہیں۔ جب بھی تشریف لاتے ہیں اور گھر میں موجود چھوٹے بچے ان کو سلام کرنے جاتے ہیں تو ان سے باتیں کر کے پیار کا اظہار کرتے ہیں۔ علماء کرام کے بارے میں عمومی تاثر یہ ہے کہ وہ بچوں کو پیار نہیں کرتے اور سختی سے پیش آتے ہیں جبکہ ڈاکٹر صاحب سنتِ رسول ﷺ کے مطابق بچوں کو پیار کرتے ہیں۔ حضرات حسن اور حسین ؓ نبی اکرم ﷺ کی کمر مبارک پر سواری کرتے تھے۔ کسی صحابیؓ نے دیکھا تو کہا: کیسی اچھی سواری ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: سوار بھی تو بہت شاندار ہیں!

سب سے دلچسپ بات یہ ہے کہ میری جتنی بھی تربیت ہوئی‘ پردے کے پیچھے سے ہوئی‘ کیونکہ ڈاکٹر صاحب عمومی طور پر خواتین سے پردے کے پیچھے ہی سے بات کرنا پسند کرتے ہیں‘ جبکہ اکثر و بیشتر تو خواتین سے ملاقات بھی کچھ ایسی خوش دلی سے نہیں کرتے۔ مجھے اس بات کا اندازہ نہیں تھا۔ سو جب بھی آتے‘ میں اپنے شوہر سے اصرار کرتی کہ جو سوالات اکٹھے ہوئے ہیں ان کے جواب کے لیے میری ملاقات کرا دیں۔ ڈاکٹر صاحب نے مان تو لیا اور ملاقات بھی کر لی‘ لیکن اس کے بعد شوہر سے کہہ دیا کہ گھر والی ملاقات کر کے اپنا بل وصول کر لیتی

ہیں۔ گو انہوں نے کہا از راہِ مذاق ہی تھا‘ لیکن پھر میں نے ملاقات کا اصرار کم کر دیا۔

جب ہمارے ہاں ٹھہرتے ہیں تو ملاقاتیوں کو پہلے سے ہی وقت دے دیا جاتا ہے‘ جن میں مردوں کی تعداد زیادہ ہوتی ہے اور خواتین چند ایک۔ لیکن جو وقت دیا جاتا ہے‘ اس کو پوری طرح فائدہ مند بناتے ہیں۔ نہ تو فضول گفتگو کی اجازت دیتے ہیں اور نہ لامحدود وقت‘ البتہ دوسرے کو بولنے کا موقع زیادہ دیتے ہیں۔ وقت پورا ہو جائے تو الوداعی الفاظ بول دیتے ہیں جس سے آنے والے کو اندازہ ہو جاتا ہے کہ اب اسے اٹھ جانا چاہیے۔

گرم چائے یا ٹھنڈے مشروب کا وقت ہو تو کھانے کے لیے اصرار نہیں کرتے۔ ہم گھر والوں کا اس معاملے میں بہت خیال رکھتے ہیں اور غیر ضروری تکلیف دینے سے بچاتے ہیں۔ عام طور پر ہم دیکھتے ہیں کہ ہر معاملے اور مواقع پر بس کھانے پینے کا چکر لگا ہے‘ خاص طور پر دین کے لیے جب لوگ اکٹھے ہوں تو کھانے پینے کا گراف کچھ زیادہ ہی اونچے درجے کا ہو جاتا ہے۔ لیکن ڈاکٹر صاحب نے کبھی اس بات کو پسند نہیں کیا۔ جس کے لیے کھانے کا کہا‘ بس اسی کو کھلایا۔ اصرار کر کے یہ بھی اصول رکھا کہ ایک وقت میں ایک ہی سالن ہو‘ اگرچہ کھانے کے معاملے میں خوش ذوق بھی ہیں۔ پاکستانی کھانوں کے علاوہ اگر کچھ اور بھی پیش کیا گیا تو انہوں نے یہ کہہ کر اس کو رد نہیں کیا کہ میں یہ نہیں کھاتا‘ بلکہ کھایا بھی اور اگر کوئی چیز اچھی لگی تو اس کی تعریف بھی کی اور یہ بھی پوچھا کہ کیسے بنائی گئی ہے‘ کیونکہ ”تھوڑا سا کوکنگ کے بارے میں مَیں بھی شُدبُد رکھتا ہوں“۔ شاید پڑھائی کے سلسلے میں ہوسٹلوں وغیرہ میں رہے ہوں!

اس سب کے ساتھ ساتھ مہمان ہونے کے آداب سے بھی پوری طرح آگاہ ہیں۔ کس وقت اور کس دن پہنچنا ہے‘ اس کی بروقت اطلاع دی جاتی ہے۔ اگر کسی بھی وجہ سے پروگرام آگے پیچھے ہو رہا ہو تو اسے بھی بتایا جاتا ہے۔ کھانا کھائیں گے یا نہیں؟ اگر کھائیں گے تو کس وقت دیا جائے؟ کھانے پر کتنے افراد ہوں گے؟ عصر کی چائے کتنے بجے دی جائے؟ ذات کے ڈسپلن اور اپنے کہے کے مطابق چلتے ہیں‘ جس سے گھر والوں کو بہت سہولت ہو جاتی ہے۔ خوامخواہ کا انتظار نہیں کرواتے۔ عام طور پر دو ملازم ساتھ ہوتے ہیں: ایک ڈرائیور اور دوسرا خدمت گار۔ شروع زمانے میں تقریباً ہر کھانے پر پوچھتے تھے کہ ان کو کھانا دے دیا؟ ورنہ اپنے ساتھ ٹیبل پر بٹھا کر کھلاتے تھے۔ میرے شوہر نے محسوس کیا کہ ڈاکٹر صاحب کی شخصیت کا ایک رُعب ہے جس کی وجہ سے ان کے ملازم پورا پیٹ بھر کر نہیں کھاتے جبکہ پردے کی وجہ سے

ہمارے گھریلو ملازمین بھی اندر ڈاکٹر صاحب کے ساتھ نہیں آ سکتے۔ سوچا گیا کہ اس ڈبل پالیسی کو ختم کیا جائے اور اپنے گھریلو ملازمین اور ڈاکٹر صاحب کے ملازمین کو پہلے ہی کھانا کھلا دیا جائے تاکہ جب ڈاکٹر صاحب پوچھیں تو انہیں پتا چل جائے کہ کھانا دے دیا گیا ہے۔ ترتیب یہ ہوئی کہ ملازمین کو ساتھ بٹھا کر کھانا کھلائیں اور جو کھانا خود کھائیں وہی ان کو کھلائیں۔ ان کے لیے موٹے جھوٹے سے پرہیز کریں اور کسی بھی معاملے میں ملازمین کو کم درجے کی شے نہیں سمجھنا۔

جب کھانا ٹیبل پر لگا دیا جاتا تھا تو کچن اور ڈرائنگ روم کے درمیان چک کا پردہ حائل کر دیا جاتا تھا' جو اسی مقصد کے لیے لگایا گیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے آغازِ زمانہ ہی میں واضح کر دیا تھا کہ گھر کی خواتین کی آوازیں براہِ راست مہمانوں اور ڈاکٹر صاحب تک نہیں پہنچنی چاہئیں۔ سو چک گرانے کے بعد ہم سب اشاروں میں باتیں کرتے تھے' جس کی وجہ سے ٹیبل پر ہونے والی گفتگو ہمیں سنائی دیتی تھی۔ باوجود پردے کے ہمیں یہ گہرا احساس رہتا تھا کہ ڈاکٹر صاحب کے رعب کی وجہ سے ٹیبل پر موجود حاضرین کی تمام گفتگو سلجھی ہوئی ہے جس میں کوئی گھٹیا مذاق نہ لمبی باتیں ہوتیں۔ اگرچہ کبھی کبھی ایک آدھ چٹکلہ بھی سنائی دیتا' لیکن اخلاق کے دائرے میں رہتے ہوئے۔ ڈاکٹر صاحب بذاتِ خود حسِ مزاح کے بھی مالک ہیں۔ ان کی گفتگو بالکل خشک نہیں ہوتی بلکہ حسِ مزاح بہت تیز ہے۔ کھانا کھا چکنے کے بعد زیادہ دیر تک میز پر نہیں بیٹھتے' فوراً اٹھ جاتے۔ یوں اہلِ خانہ کو بہت تھکا دینے والا انتظار نہیں کرنا پڑتا بلکہ سب کچھ آسانی سے اور جلدی سمٹ جاتا ہے۔ اگر کبھی مجھے ملنے کے لیے وقت دیتے تھے تو یہی چند منٹ ہوتے تھے کھانا کھا چکنے کے بعد' وہ بھی باقاعدہ اجازت لی جاتی تھی۔

لہجے کی شائستگی اتنی پیاری لگتی تھی اور اس سے ایسا گہرا احساس ہوتا تھا کہ وہ خواتین جن کے ساتھ تنظیم کی سطح سے اٹھ کر مہمان اور میزبان کا تعلق قائم ہو گیا ہو' ان سے کیسے گفتگو کی جائے۔ یہ بھی کہتے تھے کہ یہ دونوں میاں بیوی مجھے اپنے بچوں کی طرح عزیز ہیں (میری خوش بختی)' لیکن عام طور پر خواتین سے گفتگو کرتے ہوئے لہجہ سپاٹ اور قدرے غصے والا ہوتا۔

ڈاکٹر صاحب کو استعمال کے لیے دیا جانے والا کمرہ انتہائی سادہ ہے۔ دو سنگل بیڈ' ایک کین کا صوفہ' ایک میز' دو بازوؤں والی ایک عدد کرسی' ایک انتہائی سادہ الماری جس میں چند ہینگر رکھ دیے جاتے ہیں (الماری تو شاید انہوں نے کبھی کھولی ہی نہیں)' چند زائد تولیے تاکہ

ضرورت پڑنے پر انہیں استعمال کر سکیں (جو انہوں نے کبھی استعمال کیے ہی نہیں۔ وجہ؟ چیزوں کی فراوانی دیکھ کر اسے ناجائز طور پر استعمال نہیں کرتے بلکہ صرف ضرورت کے تحت۔ اپنے استعمال شدہ تولیے کو پھیلا دیتے ہیں تاکہ وہ دوبارہ ضرورت پڑنے تک خشک ہو جائے)' ایک عدد چپل' ایک عدد صاف ستھرا واش روم جس میں کوئی قیمتی چیز استعمال نہیں کی گئی (اگرچہ ڈاکٹر صاحب کی خرابی صحت کی بنا پر ایک عدد لکڑی کے سٹول کا اضافہ کیا گیا ہے تاکہ وہ اسے وہاں بیٹھنے کے لیے استعمال کر سکیں)۔ نبی کریم ﷺ کی حدیث مبارک ہے کہ وضو کے لیے اتنا ہی پانی استعمال کرو جتنی ضرورت ہے چاہے تمہارے سامنے پانی کا دریا ہی بہہ رہا ہو۔ یہ رویہ نعمت کی قدر کرنا اور اسے ضائع ہونے سے بچانا سکھاتا ہے۔

کچھ سال پہلے جنرل پرویز مشرف نے کنونشن سنٹر میں علماء اور مشائخ کی کانفرنس منعقد کی' جس کے لیے ڈاکٹر صاحب کو بھی دعوت نامہ ملا۔ اس میں آنے جانے کا کرایہ (بائی ایئر آئیں یا کسی دوسری ٹرانسپورٹ پر) اور Best Western ہوٹل میں فائیو سٹار قیام کی آفر تھی۔ ڈاکٹر صاحب نے آنے جانے کا کرایہ نہیں لیا' اپنی ذاتی سواری میں آئے۔ استفسار پر فرمایا: جب میرے پاس ذاتی سواری ہے تو میں کرایہ کیوں لوں؟ پھر یہ کہ اوپر بیان کیے گئے سادہ سے کمرے میں قیام کیا۔ ساتھیوں نے کہا: آپ دوسرے علماء کے ساتھ بیسٹ ویسٹرن میں کیوں نہیں ٹھہرے؟ کنونشن سنٹر کے قریب تھا' آپ کو آنے جانے میں آسانی ہوتی۔ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا: میرے لیے یہ کمرہ کسی فائیو سٹار ہوٹل سے کم نہیں۔ بلاضرورت میں سرکاری خرچہ کیوں لوں؟ ان کے اس عمل نے مجھے بہت متاثر کیا۔ الحمد للہ' ایسے وقت میں کوئی ایک تو ایسا ہے جو اپنے رویے سے یہ نہیں کہہ رہا کہ مالِ مفت دلِ بے رحم (سرکاری مال کا بے دریغ خرچ)۔

جب کہیں درس کے لیے بھی جاتے ہیں تو عام طور پر اکیلے ہی' کوئی مخصوص لوگوں کا مجمع ان کے ساتھ نہیں ہوتا جیسے روایتی طور پر علماء حضرات کے ساتھ ہوتا ہے یا سیاسی لوگوں کے ساتھ بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ جتنا میں نے دیکھا اور محسوس کیا' زندگی کے ہر معاملے میں تقریباً غیر روایتی انداز۔ لباس بھی ماشاء اللہ صاف ستھرا استعمال کرتے ہیں۔ اتنے سارے برسوں میں صرف ایک دفعہ کپڑے استری کے لیے اندر بھجوائے گئے' جس سے لباس کی نفاست کا اندازہ لگایا گیا۔ صاف ستھرا' سفید' بے داغ لباس! ماشاء اللہ منظم زندگی اور مسلسل جدوجہد! اللہ

سبحانہ وتعالیٰ اور رسول کریم ﷺ کے دین کو نافذ کرنے کے لیے ہر قسم کی صلاحیت لگا رہے ہیں۔ اپنے لیکچروں میں غیر روایتی لیکن مسنون انداز ہے۔ فضول قسم کی قصہ گوئی نہیں بلکہ مضبوط دلائل جن سے فکرِ آخرت پیدا ہوتی ہے اور موت سے بے خوفی۔ انسان جب یہ جان جاتا ہے کہ اب میرا کوئی اختتام نہیں بلکہ موت بھی زندگی ہی کا تسلسل ہے تو بہت سی فکروں سے آزاد ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے لہجے کا یقین و اعتماد چودہ سو سال پہلے کی یاد تازہ کر دیتا ہے‘ جس سے بندہ ان مقدس ہستیوں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی محبت کو نہ صرف محسوس کر سکتا ہے بلکہ ان سے اپنا ایک تعلق بھی محسوس کر سکتا ہے۔ کبھی سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ سے ہم کلام ہونا محسوس ہوتا ہے تو کبھی سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی تلوار بار بار نیام سے نکلتی دکھائی دیتی ہے ان الفاظ کے ساتھ کہ حضورؐ اجازت ہو تو اس کی گردن اڑا دوں! دین کے لیے اتنے جوشیلے کہ ان کے غصے کو محسوس کر کے کبھی کبھی تبسم کرنے کو جی چاہے‘ لیکن ان کا یہی رویہ آگے چل کر ان کو دنیا کے ایک بڑے حصے کا فاتح بنا گیا۔ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کی نرم و گداز شخصیت بھی اپنی انتہائی ملائمت کے ساتھ جلوہ گر ہوتی ہے تو سیدنا علی رضی اللہ عنہ اپنی ناقابلِ تسخیر شجاعت کے ساتھ نظر آتے ہیں۔ اور سیدنا بلال رضی اللہ عنہ کا انداز تو کیا کہنا‘ ایسی غلامی پر کروڑوں آزادیاں قربان!

میرے مشاہدے کے مطابق‘ ڈاکٹر صاحب کے قول و فعل میں بھی تضاد نہیں ہے۔ ایک دفعہ جس چیز کے لیے شرح صدر ہو گیا‘ اسے اپنا لیا اور پھر ڈٹ گئے۔ زمانے کی پروا نہیں کی‘ چاہے شادی بیاہ کا سسٹم ہو یا تعزیت کی رسومات۔ اس حوالے سے ایک تصویری ثبوت بھی ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنی تقریر میں فرمایا کہ قیام‘ رکوع و سجود اللہ تعالیٰ کے لیے مخصوص ہیں‘ انہیں کسی اور کے لیے نہیں ادا ہونا چاہیے۔ ملکی جھنڈے کو سلامی ہے نہ ترانے کے لیے کھڑا ہونا صحیح ہے۔ جھنڈا ایک فوج کی علامت ہے اور اس کا نشان ہے‘ اسے سلامی پیش کرنے کی ضرورت نہیں۔ الحمرا ہال لاہور میں نظریہ پاکستان کے لیے تقریب تھی جس میں ڈاکٹر صاحب کو مدعو کیا گیا۔ قومی ترانے کے لیے کھڑے ہونے کی درخواست کی گئی تو سب لوگ کھڑے ہو گئے‘ ڈاکٹر صاحب بیٹھے رہے۔ اگر کھڑے ہو جاتے تو اپنی ہی بات کی کاٹ ہو جاتی۔ وہ تصویر ’’نوائے وقت‘‘ کے پہلے صفحے پر سب سے اوپر شائع کی گئی اس کیپشن کے ساتھ کہ ترانے کے لیے سب کھڑے ہیں لیکن ڈاکٹر صاحب نہیں۔ اچھا ہے‘ اس طرح اپنے عمل سے تبلیغ خود بخود

ہو جاتی ہے۔ عام طور پر ایسی باتوں پر غور نہیں کیا جاتا۔ جھنڈے کو سلامی بھی تو دوسری اقوام کی نقالی ہے۔ عالم باعمل اس زمانے میں خال خال ہی نظر آتے ہیں۔ شاید اسی وجہ سے ڈاکٹر صاحب کی اولاد میں بیٹے‘ بیٹیاں‘ بہویں‘ داماد‘ پوتے‘ پوتیاں‘ نواسے‘ نواسیاں سب کے سب ڈاکٹر صاحب کے مشن کا حصہ بنے ہوئے ہیں۔ یہ بہت کم خوش نصیبوں کو نصیب ہوتا ہے۔ شاید ڈاکٹر صاحب کے مشن کا خلوص ہے جس کی وجہ سے ایسا ہوا!

اصحابِ صفہ اسلام کی سب سے پہلی درس گاہ اور تربیت گاہ سے فیض یاب ہوئے۔ کیا بڑے بڑے عالم اور بہترین جرنیل اس ٹاٹ سکول (شاید ٹاٹ بھی میسر نہ ہو اور زمین ہی پر بیٹھتے ہوں) سے نکلے اور تمام دنیا میں پھیل گئے۔ کیوں؟ نبی کریم ﷺ کے پیغام کو آگے بڑھانے کے لیے‘ کیونکہ نبی کریم ﷺ نے حجۃ الوداع میں سوا لاکھ کے مجمع سے یہ وعدہ لیا تھا کہ میرا پیغام آگے پہنچاؤ گے۔ سب نے اقرار کیا تھا۔ اس مقدس جماعت نے اپنے حبیب ﷺ کی بات کو مانا۔ کسی ایک نے بھی یہ نہیں کہا کہ ہم نے رسول اللہ ﷺ کی بات کو سمجھ تو لیا ہے لیکن کیا کریں کہ ہمارا دل شہر مدینہ سے جدا ہونے کو نہیں چاہتا! وہ تبلیغ اور جنگوں کے لیے تقریباً پوری دنیا میں پھیل گئے۔ سیدنا بلال رضی اللہ عنہ اسلامی لشکر کے ساتھ محاذ پر چلے گئے۔ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کا مرقد چین میں ہے۔ ہمارے شمالی علاقوں میں بھی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی قبریں ہیں۔ بلوچستان کے ساحل پر جو مکرانی آباد ہیں وہ اُن بحری جہازوں میں آئے تھے جنہوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں حملہ کیا تھا‘ کیونکہ نبی کریم ﷺ نے ہندوستان پر حملہ کرنے والوں کو جنت کی خوش خبری سنائی تھی۔

پاکستان میں رہتے ہوئے بیعت کی بنیاد پر ایک بہترین اور منظّم جماعت کی تشکیل‘ انجمن خدام القرآن‘ خصوصاً اس کا شعبہ سمع و بصر اور قرآن کالج‘ اور بھی کئی ادارے اور شعبے جن کا ذکر کرنے سے بات طویل ہو جائے گی۔ عمومی طور پر زیادہ پڑھے لکھے افراد (ڈاکٹر‘ انجینئر‘ پروفیسر وغیرہ) ڈاکٹر صاحب کے درس سے متاثر ہوتے ہیں۔ کیو ٹی وی‘ Peace ٹی وی‘ اے آر وائے‘ جیو‘ ان سب چینلز پر ڈاکٹر صاحب کے درسِ قرآن کا سلسلہ جاری ہے۔ ایک بڑا پیارا جملہ جو پیس ٹی وی پر ڈاکٹر صاحب سے سننے کو ملتا ہے: ’’درس دینے سے کسی اور کی ہدایت ہو نہ ہو‘ درس دینے والے کی اپنی ہدایت ہو گئی‘‘۔ یعنی اب وہ لوگوں کے مانجھے میں آ گیا۔ جتنے ہاتھ

اٹھیں گے، چمک میں اتنا ہی اضافہ ہوگا (لوگ طرح طرح کی باتیں بنائیں گے، نقص نکالیں گے اور وہ کیڑے بھی جو ساری زندگی نہ دیکھے نہ سوچے سب آپ کی ہتھیلی پر رکھ دیے جائیں گے۔ اگر نیت درست ہوئی تو انسان ان غلطیوں کو درست کر کے اپنی چمک میں اضافہ کر سکتا ہے)۔

ڈاکٹر صاحب رزقِ حلال پر بھی بہت زور دیتے ہیں کیونکہ اس کے بغیر ہمیں اعمالِ صالحہ حاصل ہو نہیں سکتے، بالکل اسی طرح جیسے صاف پانی کے گلاس کو ہم اپنی ایک گندی انگلی پانی کے اندر ڈال کر اٹھائیں تو اس پانی کو ہم صاف نہیں کہیں گے۔ حرام تھوڑا ہو یا زیادہ، ہے تو حرام ہی!

ڈاکٹر صاحب بے جا کسی کا احسان نہیں لیتے! ابتدائی زمانے میں جب بیعت کی گئی تو یہ بات نوٹس میں آئی کہ اقتدار صاحب (چھوٹے بھائی) جب بھی اپنی تحریر میں ڈاکٹر صاحب کا ذکر کرتے ہیں تو ہمیشہ میرا ''ماں جایا'' کا لفظ استعمال کرتے ہیں، جس سے ان کی ڈاکٹر صاحب سے گہری محبت کا احساس ہوتا ہے۔ انہوں نے ڈاکٹر صاحب کے لیے ان کے کمرے میں ایئر کنڈیشنر لگوایا، تاکہ ڈاکٹر صاحب کو گرمیوں میں کچھ آرام مل سکے۔ انہیں شاید دوائیاں زیادہ استعمال کرنے کی وجہ سے یا پھر شوگر کی وجہ سے بھی گرمی زیادہ محسوس ہوتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنے بھائی سے پوچھا: آپ نے یہ کس لیے لگوایا ہے؟ اقتدار صاحب کہنے لگے: اللہ کی خاطر! ڈاکٹر صاحب نے فرمایا: پھر تو ٹھیک ہے، اگر تم کہہ دیتے بھائی کی خاطر تو میں یہ پیشکش قبول نہ کرتا۔ اسی خطرے کے پیش نظر میری جب بھی ڈاکٹر صاحب سے بات ہوئی، میں نے یہی کہا کہ ڈاکٹر صاحب آپ جب آتے ہیں تو یہ سب اللہ کی خاطر کیا جاتا ہے اور مجھے پختہ یقین ہے اللہ سبحانہ وتعالیٰ مجھے آپ کے کام میں سے اجر عطا فرمائیں گے، کیونکہ جو مددگار ہوتے ہیں ان کو بھی اجر دیا جاتا ہے اور کام کرنے والے کے اجر میں کوئی کمی نہیں ہوتی۔

ایک دفعہ ڈاکٹر صاحب کی اہلیہ محترمہ سے فون پر بات ہو رہی تھی۔ فرمانے لگیں کہ بیٹی کیسے کر لیتی ہو سب کچھ؟ ڈاکٹر صاحب جب بھی اسلام آباد سے آتے ہیں بہت ہی خوش آتے ہیں۔ میں نے خوش ہو کر جواب دیا کہ مجھے ڈاکٹر صاحب سے محبت ہے، کیونکہ ان کی وجہ سے مجھے وہ سیدھی اور متوازن راہ ملی جس سے میں نے اپنے ربّ تعالیٰ کو چوبیس گھنٹے کے لیے پا لیا، صرف by part نہیں۔ تشکّر کا یہ بھی ایک طریقہ ہے!

﴿هَلْ جَزَآءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانُ ۝٦٠﴾ (الرحمٰن)

''اور کیا بدلہ ہے نیکی کا مگر نیکی!''

شکر جہاں نعمت کو محفوظ کرتا ہے وہاں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی اطاعت کا بڑا مضبوط جذبہ بھی پیدا کرتا ہے اور اطاعت میں اضافہ بھی ہوتا ہے۔

تزکیۂ نفس کے لیے قرآن حکیم کو سمجھنا اور سنّتِ نبویؐ پر عمل پیرا ہونا بہت ضروری ہے، چاہے وہ مسنون دعاؤں کی شکل میں ہو یا عمل کی صورت میں۔ اس کا نتیجہ جو فوری طور پر میری سمجھ میں آیا ہے، دل و دماغ کی وسعت ہے۔ آپ کے اندر گھٹن اور تنگی نہیں رہ جاتی۔ یہ سب کر کے محسوس کیا جانا چاہیے۔ رسول اللہ ﷺ نے طائف میں جو پتھر اپنے جسمِ اطہر پر سہے تھے، ان کی تکلیف ہمیں اپنے دل میں محسوس ہو۔ اس واقعہ کو پڑھ کر محض رونے دھونے کی بجائے آپ ﷺ کے لائے ہوئے دین پر عمل پیرا ہوں تو سمجھیں آج بھی ہم نے رسول اللہ ﷺ کی مدد کی ہے۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے دین کو سربلند کرنے کے لیے یہ ایسا ہی ہوگا کہ وہ پتھر ہم نے اپنی جھولی میں چن لیے ہیں، سمیٹ لیے ہیں، آپ ﷺ کی تکلیف کو اپنے دل میں محسوس کیا ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے سب سے پہلے ہم دین پر خود عمل پیرا ہوں، پھر اسے دوسروں تک پہنچانے کی شعوری کوشش کریں اور بالآخر اس گروہ میں شامل ہو جائیں جو پورے کرۂ ارضی پر دین اسلام کو نافذ کرنے کے لیے کوشاں ہے۔ حقیقت یہی ہے کہ ان پتھروں کو چننے کا طریقہ ہم نے ڈاکٹر صاحب سے سیکھا۔ الحمد للہ!

تین اہم باتیں

(۱) ڈاکٹر صاحب کی اردو بڑی مشکل ہے، میرے لیے ذاتی طور پر تو نہیں رہی لیکن عام طور پر لوگوں کو یہ گلہ کرتے سنا ہے۔ مشکل زبان کی وجہ سے ان کا درس عام فہم نہیں ہوتا اور یوں ایک مخصوص پڑھا لکھا طبقہ ہی ان کے دروس سے متاثر ہو پاتا ہے، جبکہ proper through channel والی بات عام فہم ہونی چاہیے۔ باقی علماء اس بات کو اتنے اچھے طریقے سے پروموٹ نہیں کر پا رہے۔ زبان دانی اسے عام لوگوں تک پہنچانے میں ایک رکاوٹ بن رہی ہے۔

(۲) ڈاکٹر صاحب کی شخصیت کا رعب دوسروں کو ان سے بے تکلّف نہیں ہونے دیتا، نہ ہی وہ کسی کے ساتھ غیر ضروری بے تکلف ہوتے ہیں، جبکہ اس وقت وہ جس مقام پر ہیں اس کا تقاضا یہ ہے کہ علم کے ساتھ ساتھ دوسروں سے انڈرسٹینڈنگ بھی پیدا ہو۔ بات اب صرف علم کی حد تک ہی نہیں رہنی چاہیے، بلکہ تربیت کے دائرے میں بھی داخل ہو۔ تربیت کے بغیر تو علم ایک طرف سے آیا اور دوسری طرف سے نکل گیا۔

(۳) ٹی وی پر نشر ہونے والے ان کے مختلف پروگراموں میں سامعین ڈسپلن سے نہیں بیٹھے ہوتے۔ پیس چینل کو دیکھنے والے اس بات کو زیادہ محسوس کرتے ہیں کہ پاکستان میں ایسا مجمع نصیب نہیں ہوتا اور نہ ہی تعداد اتنی بنتی ہے۔ تعلیم کے ساتھ تربیت بھی بہت ضروری ہے جبکہ تنظیم اسلامی کے ممبران میں اس چیز کی بہت کمی نظر آتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا اُسوۂ مبارک تو تعلیم کے ساتھ تربیت بھی تھا۔ ارکانِ اسلام کی تربیت جب مضبوط ہو جائے تو پھر ایک ایک سنّت مطہّرہ کو یاد کرنے اور اپنی ذاتی زندگی میں شامل کرنے پر زور دیا جائے۔ سنت مبارکہ قرآن حکیم ہی کی تشریح تو ہے۔

یہ تینوں باتیں ذاتی مشاہدات ہیں' ہوسکتا ہے کہ دوسرے لوگوں کو محسوس نہ ہوں۔ واللہ اعلم! بس ایک اظہار کر دیا ہے' اب یہ میرے محترم استاد کی مرضی ہے کہ وہ اس کو کیسے لیتے ہیں اور اس کے لیے کچھ کرتے ہیں یا نہیں۔ اس دعا کے ساتھ اختتام کرتی ہوں کہ ربّ رحیم و کریم و غفور و حلیم میرے استاد مکرم پر خاص رحمتوں کی بارش کرے اور صحت کے مسائل کے باوجود ان کا بڑھاپا بہت آسان اور ہلکا کر دے اور انہیں دنیا و آخرت میں سرخرو فرمائے' کامیاب کرے اور اجرِ عظیم سے نوازے!

پس نوشت

یہ باب میری زیر طبع کتاب ''۳۶۰'' کا ہے اور یہ کتاب میں نے ڈاکٹر اسرار احمد کے نام کی ہے۔ خوش قسمتی سے یہ باب میں نے انہیں لاہور بھیج دیا تھا تا کہ وہ دیکھ لیں' کوئی قابل اعتراض بات نہ ہو جو ان کی دل آزاری کا باعث بنے۔ سو انہوں نے چیک کر کے مجھے بھیج دیا تھا۔

میری پہلی کتاب کا نام ''سنت نبویؐ کے مطابق شادی بیاہ'' ہے' جو ڈاکٹر صاحب کی تحریک ہی سے متاثر ہو کر لکھی گئی اور اپنے چاروں بچوں کی شادی بھی اسی کے مطابق کی۔ دوسری کتاب ''لاحاصل'' کے نام سے ہے' جو میں نے اپنی والدہ مرحومہ کے نام کی تھی اور اسے بنتِ اُمینہ بانو کے نام سے لکھا تھا۔ اب یہ تیسری کتاب ''۳۶۰'' کے نام سے ہے' جو پہلی محرم سے تیس ذوالحجہ تک دن اور رات جو قرآن وسنت سے ثابت ہیں' ہمیں رب رحیم نے دیے ہیں' ان کا علم ہے۔ ماں باپ کے بعد تیسرا حق استاد کا ہوتا ہے سو یہ ان کے نام کر دی۔

یہ کتاب شائع ہونے سے پہلے میں ''نوائے وقت'' کو ارسال کر رہی ہوں تا کہ اپنے محترم استاد کو خراجِ عقیدت پیش کر سکوں۔ آج وہ ہم میں نہیں ہیں' لیکن کتنی خوشی کی بات ہے

کہ وہ ایک بھرپور زندگی گزار گئے۔ آخری لمحے تک اپنے مشن کو نبھایا۔ کتنے مبارک ہوتے ہیں ایسے لوگ! رات چار بجے جب فون میسج سے یہ خبر چلی تو بے اختیار میرے منہ سے نکلا: ''ربّ کعبہ کی قسم وہ کامیاب ہو گئے''[1]۔ اللہ رب رحیم! مجھ سے بھی اپنے دین کا کام اس طرح لے لینا تا کہ میرا شمار بھی کامیاب لوگوں میں ہو جائے' ان شاء اللہ!

دوسری بات جو ہوک کی شکل میں میرے سینے سے نکلی' ڈاکٹر صاحب پاکستان کے غم سے آزاد ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنے پاس بلا لیا۔ آ جاؤ' بہت رو لیا' بہت غم کر لیا' بہت تڑپ لیا۔ آ جاؤ کہ تمہاری بے قراریوں کو قرار آ جائے۔

اللہ سبحانہ وتعالیٰ ڈاکٹر صاحب کے پاکستان کا حامی و ناصر ہو! ہم جو ان کی معنوی اولاد ہیں' اپنی ساری توانائیاں' وقت' صلاحیتیں اپنے استادِ محترم کی طرح احیاءِ اسلام کی کوششوں میں لگا دیں' کھپا دیں۔ استاد سے محبت کا حق تو تبھی ادا ہو گا جبکہ ان کے مشن کو زندہ رکھا جائے اور جدّوجہد جاری رہے نتیجے کی پروا کیے بغیر' کیونکہ وہ اپنا حصّہ مکمل کر کے حجّت قائم کر گئے۔ ہم نے اپنا جواب دہ ہونا ہے۔

اے اللہ' اے ربّ رحیم' اے پروردگارِ عالم! ہم بہت گناہ گار ہیں' اپنے گناہوں کی طرف دیکھیں تو شرم آتی ہے۔ رجوع کر کے' تیری آن بان شان کی طرف دیکھیں تو تو اللہ اکبر ہے۔ ہمیں ہماری سوچ سے بڑھ کر خیر عطا فرما۔ ہم سب کو قبول فرما لے۔ ہمیں توفیق دے' مواقع دے کہ ہم تیرے رسول ﷺ کے مشن کو مکمل کر دیں۔ ہم اس وقت تک چین سے نہ بیٹھیں جب تک پورے کرۂ ارض پر تیرا پیغام پہنچ نہیں جاتا۔ ہم سب کو آسانیاں عطا فرما۔ ہمارے لیے یہ کام آسان فرما دے اور ہمیں آسانیاں بانٹنے کا شرف بھی عطا فرما۔

اے ہمارے پیارے رب! ڈاکٹر صاحب کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرنا' ان کی محنت کا اجر کئی گنا بڑھا کر دینا' ان کی کمیوں کوتاہیوں سے صرفِ نظر فرمانا اور ان کو بخش دینا' ان کو بہترین بلند درجات عطا فرمانا۔ آمین' ثم آمین!

---

(۱) دین کے لیے جو وہ کرنا چاہتے تھے' بھرپور طریقے پر کرتے ہوئے دنیا سے گئے۔ اگلی کامیابی کا دعویٰ ہم نہیں کر سکتے۔

☆☆☆

یہ ایک شخص کی نہیں، پوری قوم کی دیت ہے!

ابوالحسن علوی

بالآخر وفاقی اور صوبائی حکومت امریکہ بہادر کی آشیر باد حاصل کرنے کے لیے ریمنڈ ڈیوس کو دو پاکستانیوں فہیم اور فیضان کے قتل کے کیس سے بری کروانے اور کابل بھجوانے میں کامیاب ہو ہی گئی ہے۔ اخبارات اور میڈیا کے مطابق مقتول فہیم اور فیضان کے ورثاء کو بیس کروڑ روپے بطور دیت ادا کیے گئے ہیں' جبکہ ہیلری صاحبہ یہ دعویٰ کر رہی ہیں کہ ہم نے یہ دیت ادا نہیں کی ہے۔ یعنی امریکی تو کسی پاکستانی کے قتل کو اس قدر بھی اہمیت نہیں دیتے کہ اس کی دیت ہی ادا کر دیں۔ ہیلری کا یہ بیان پوری قوم کے منہ پر طمانچہ ہے اور ذلیل کرنے کی انتہا ہے۔ یہ دو پاکستانیوں کی نہیں پوری قوم کی غیرت وحمیت اور عزتِ نفس کے قتل کی دیت ادا کی گئی ہے۔ ایک امریکی نے کہا تھا کہ پاکستانی تو دس ڈالر میں اپنی ماں کو بھی بیچ دیتے ہیں اور اب بیس کروڑ میں پوری قوم کا سودا کر دیا گیا۔ گویا ہر پاکستانی کو ایک روپیہ بطورِ دیت ادا کیا گیا ہے۔

ہم یہ کہتے ہیں کہ ریمنڈ ڈیوس کا مسئلہ دو پاکستانیوں کے قتل کا مسئلہ نہیں تھا' بلکہ یہ ایک قوم کی آزادی' غیرت' حمیت' وقار اور عزتِ نفس کا مسئلہ تھا۔ مسلم لیگ کے جیالے اور صوبائی وزیر قانون رانا ثناء اللہ صاحب میڈیا میں یہ دعویٰ کرتے نظر آ رہے ہیں کہ ریمنڈ کیس کا فیصلہ اسلامی شریعت اور قانون کے مطابق ہوا ہے۔ اس مملکت خداداد کو نظامِ عدل وقسط کے لیے ترستے ہوئے ۶۳ سال گزر گئے لیکن ظالم وفاسق حکمرانوں نے یہاں اسلامی قانون کے نفاذ میں ہمیشہ روڑے اٹکائے اور آج اپنے ایک امریکی آقا کی جان بچانے کے لیے ان غلاموں کو اسلامی قانون یاد آ گیا ہے۔ ڈرون حملوں کے ذریعے وزیرستان میں شہید ہونے والے ہزاروں مسلمان بچوں' عورتوں' بوڑھوں اور شہری جوانوں کے قصاص اور دیت کے لیے انہیں کبھی اسلامی قانون یاد نہیں آیا؟ ریمنڈ ڈیوس کیس کے دو پہلو ہیں:

قومی پہلو

سی آئی اے' بلیک واٹر اور ڈرونز پاکستان میں جو کچھ کر رہے ہیں اگر اس کے تناظر میں دیکھا جائے تو ریمنڈ ڈیوس کا مسئلہ صرف قصاص کا نہیں ہے' بلکہ یہ قصاص سے بڑھ کر 'فساد فی الارض' اور 'حرابہ' کا مسئلہ ہے۔

(۱) ریمنڈ ڈیوس حربی یعنی جنگی کافر تھا' کیونکہ یہ سی آئی اے کا ایجنٹ تھا اور اس امریکی خفیہ تنظیم کے لیے عرصہ دراز سے مسلمانوں اور اسلام کے خلاف پاکستان کی حدود میں کام کرتا رہا ہے۔ اور حربی کافر کی سزا گردن اڑانا ہے۔ قرآن مجید میں سورۃ المائدۃ کی آیت ۳۳ میں اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ محاربہ یعنی جنگ کی سزا بُری طرح قتل کرنے' سولی دینے' مخالف سمت سے ہاتھ پاؤں کاٹنے اور قید کرنے کی صورت میں بیان کی گئی ہے۔

(۲) ریمنڈ ڈیوس' دن دیہاڑے دوہرے قتل میں ملوث ہونے کی وجہ سے صرف قانونِ قصاص کا مستحق نہیں تھا' بلکہ اس پر فساد فی الارض کی آیات کا بھی اطلاق ہوتا ہے۔ یعنی جب قتل وغارت کی نوعیت ایسی ہو کہ اس سے زمین میں فساد پھیلے' لوگوں میں خوف و ہراس اور دہشت پیدا ہو تو ایسی قتل وغارت کو 'حرابہ' کہتے ہیں جس کی سزا سورۃ المائدۃ کی آیت ۳۳ میں بری طرح قتل کرنے یا بری طرح سولی دینے یا مخالف سمت سے ہاتھ پاؤں کاٹنے یا قید کرنے کی صورت میں دی جاتی ہے۔ جس قدر 'حرابہ' یعنی دہشت گردی میں شناعت' قباحت اور ظلم وزیادتی ہو گی' اسی نسبت سے ان سزاؤں میں سے کوئی سخت تر یا کم تر یا ایک سے زائد سزاؤں کا بھی مجرم پر اطلاق ہو سکتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِيْنَ يُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَسْعَوْنَ فِي الْاَرْضِ فَسَادًا اَنْ يُّقَتَّلُوْٓا اَوْ يُصَلَّبُوْٓا اَوْ تُقَطَّعَ اَيْدِيْهِمْ وَاَرْجُلُهُمْ مِّنْ خِلَافٍ اَوْ يُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِ ۭ ذٰلِكَ لَهُمْ خِزْيٌ فِي الدُّنْيَا وَلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۳۳﴾

''جو لوگ اللہ اور اس کے رسول (ﷺ) سے جنگ کرتے ہیں اور زمین میں فساد برپا کرتے ہیں تو ان کی سزا صرف یہی ہے کہ انہیں بری طرح قتل کیا جائے یا انہیں بری طرح سولی دی جائے یا ان کے مخالف سمت سے ہاتھ پاؤں کاٹ دیے جائیں یا انہیں قید کر دیا جائے۔ یہ ان کی رسوائی ہے اس دنیا میں اور آخرت میں بھی ان کے لیے ایک

بہت بڑا عذاب ہے۔''

(۳) فقہاء کی اصطلاحات کی روشنی میں پاکستان میں ریمنڈ ڈیوس کی موجودگی کی وضاحت تین طرح سے ہوتی ہے۔ یا تو ریمنڈ ڈیوس امریکی حکومت کا جاسوس اور سی آئی اے کا ایجنٹ تھا اور ریاست پاکستان اور اسلام کے خلاف سرگرمیوں میں ملوث تھا' تو اس صورت میں وہ 'حربی کافر' شمار ہوتا ہے جو مُباح الدم ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ وہ پاکستانی ریاست کا 'ذمّی' ہو' یعنی پاکستانی ریاست میں اس کا قیام ایک اقلیتی غیر مسلم فرد کی حیثیت سے مستقل ہو۔ لیکن 'ذمی' کا اطلاق ریمنڈ ڈیوس پر کسی طور نہیں ہوسکتا ہے۔ تیسری صورت یہ ہے کہ وہ 'مستأ من' ہو' یعنی حکومت پاکستان سے امن طلب کر کے پاکستان میں کچھ وقت کے لیے داخل ہوا ہو' جیسا کہ عام طور پر سیاحین وغیرہ کا معاملہ ہوتا ہے۔ اگر ریمنڈ ڈیوس کی ریاست پاکستان اور اسلام کے خلاف سرگرمیاں ثابت نہ ہوں تو اس پر 'مستأ من' کا اطلاق ہوتا ہے۔ اور 'مستأ من' جب امن طلب کر کے کسی ریاست میں داخل ہو اور وہاں قتل و غارت کے ذریعے امن وامان کو تباہ کر دے تو وہ ریاست کے پہلو سے واجب القتل ہو جاتا ہے۔

خاندانی مسئلہ

اگر تو ریمنڈ ڈیوس کا مسئلہ ایک خاندان اور صرف قصاص کا مسئلہ قرار دیا جائے' جیسا کہ حکومت پاکستان اس کیس کو صرف اسی پہلو سے دیکھ رہی ہے' تو پھر بھی اس کیس کا فیصلہ غلط ہوا ہے:

(۱) اگر ایک مسلمان کسی دوسرے مسلمان کو قتل کر دے تو اس صورت میں تین آپشنز ہیں: یا تو قاتل سے قصاص لیا جائے' یا پھر ورثاء قاتل سے دیت لے لیں یا پھر اسے معاف کر دیں۔ اور اگر کوئی کافر کسی مسلمان کو عمداً قتل کر دے تو اس صورت میں قصاص ہی ہے' کیونکہ قرآن میں قتلِ عمد کی صورت میں دیت یا عفو کی ادائیگی کے حکم میں ﴿فَمَنْ عُفِیَ لَہٗ مِنْ اَخِیْہِ شَیْءٌ﴾ کے الفاظ ہیں۔ یعنی اگر قاتل کو اس کے بھائی یعنی مقتول کے ولی کی طرف سے کچھ معاف کر دیا جائے۔ یہاں مقتول کے ولی کو قاتل کا بھائی قرار دیا گیا ہے اور ﴿اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَۃٌ﴾ کے قرآنی حکم کے تحت ایک مسلمان ہی دوسرے مسلمان کا بھائی ہوسکتا ہے۔ مزید برآں آیت کے آخر میں دیت یا عفو کے حکم کو ﴿ذٰلِكَ تَخْفِیْفٌ مِّنْ رَّبِّکُمْ وَرَحْمَۃٌ ؕ﴾ کے الفاظ میں تخفیف اور رحمت قرار دیا گیا ہے جبکہ تخفیف اور

رحمت اللہ کی نعمتیں ہیں جن کے مستحق کسی طور بھی کفار نہیں ہو سکتے ہیں۔ کافر سے کسی مسلمان کے عمداً قتل کے بدلے دیت یا عفو کا آپشن قبول کرنے کی کوئی شرعی دلیل ہمارے علم میں کم از کم نہیں ہے۔

(۲) صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی ایک روایت کے مطابق اللہ کے رسول ﷺ کے زمانہ میں ایک یہودی نے ایک لونڈی کا سر کچل دیا اور بعد میں اپنے اس قتل کا اعتراف کر لیا تو آپ ﷺ نے قصاص میں اس یہودی کا سر بھی پتھر سے کچلوا دیا۔ یہاں تو ایک لونڈی کا مسئلہ تھا کہ جس کے مالکان بڑی آسانی سے دیت قبول کر لیتے' لیکن اس یہودی کو دیت کی کوئی آپشن دیے بغیر قصاص میں قتل کیا گیا۔

(۳) روزنامہ جنگ ۱۷/ مارچ کے بیان کے مطابق ایک حاضر سروس فاضل جج نے اس نکتے کی طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ پشاور ہائی کورٹ نے اپنے ایک فیصلہ (پی ایل ڈی ۲۰۰۶ء پشاور ۸۲) میں مجرم کو دیت کی ادائیگی کے بعد بھی رہا نہیں کیا تھا۔ لہٰذا ریمنڈ ڈیوس کے مسئلہ میں اس فیصلے کو عدالتی نظیر (precedent) بنانا چاہیے تھا' کیونکہ ریمنڈ ڈیوس فساد فی الارض کا مرتکب ہوا تھا۔

(۴) جن دو افراد کو ریمنڈ ڈیوس نے قتل کیا تھا یعنی فہیم اور فیضان' ان میں سے ایک یعنی فہیم کی اہلیہ نے حکومت پاکستان سے اس مسئلہ میں عدل وانصاف کی امید ختم ہو جانے پر خودکشی کر لی تھی۔ اس خاتون کی خودکشی کے بعد یہ دعویٰ سمجھ سے بالاتر ہے کہ مقتولین کے تمام ورثاء دیت لینے پر راضی تھے۔

(۵) روزنامہ جنگ ۱۷/ مارچ کے بیان کے مطابق دیت کی رقم پاکستانی قومی خزانے سے ادا کی گئی ہے اور اس کی وجہ پاکستانی سرکار نے ''قومی خودداری'' بتلائی ہے۔ ایک کافر کی دیت اور وہ بھی کروڑوں میں' مسلمانوں کے بیت المال یا خزانے سے کیسے ادا کی جاسکتی ہے؟ مسلم لیگ کے مفتی رانا ثناء اللہ صاحب اس بارے میں بھی شرعی رہنمائی ضرور فرمائیں۔

(۶) قتلِ عمد کی صورت میں دیت کی مقدار سو اونٹ ہے اور اگر ان سو اونٹوں کی قیمت نکالی جائے تو ایک مقتول کی دیت تقریباً ایک کروڑ روپے بنتی ہے' اور اگر سونے کو نصاب بنائیں تو بمشکل پونے دو کروڑ روپے بنتی ہے۔ دو مقتولوں کی دیت دو کروڑ یا ساڑھے تین کروڑ روپے بنتی ہے تو بقیہ اٹھارہ یا ساڑھے سولہ کروڑ روپے قومی خزانے سے کس

خوشی میں ادا کیے گئے ہیں؟ اسلامی دیت تو دو سے ساڑھے تین کروڑ روپے بنتی ہے جبکہ بیس کروڑ دیت صوبائی اور وفاقی حکومت نے کس مذہب کے تحت ادا کی ہے' اس کی بھی ذرا وضاحت کی جائے!

(۷) مقتولین فیضان اور فہیم کے ورثاء کو پاکستانی قوم کی طرف سے ناپسندیدہ شخصیت قرار دینا چاہیے' کیونکہ انہیں اتنی زیادہ رقم پاکستانی قوم' سیاسی اور مذہبی تحریکوں اور عوام کے زبردست احتجاج اور پریشر کی وجہ سے ملی ہے' ورنہ تو انہیں بیس کروڑ تو کجا بیس لاکھ بھی نہ ملنے والے تھے۔ پس ان مقتولین کے ورثاء کا پاکستانی قوم کے احتجاج کی قیمت پاکستانی خزانے سے وصول کرنا ایک بہت ہی قابلِ نفرت عمل ہے اور ایسی رقم سے انسان کو کبھی قلبی سکون میسر نہیں آ سکتا۔

ڈاکٹر عافیہ صدیقی نے تو کسی امریکی کو قتل بھی نہیں کیا تھا' بلکہ صرف گولی چلانے کا الزام تھا تو اس کی دیت امریکہ قبول کیوں نہیں کر لیتا؟ خوددار ہمارے حکمران نہیں بلکہ امریکہ ہے۔ اور دوسری طرف ہم' یعنی پاکستانی' مقتول بھی ہم ہیں اور دیت بھی ہم ہی ادا کر رہے ہیں۔ اسے کہتے ہیں ہمارے حکمران قومی خودداری!!

غیر ملکی کمپنی کی مصنوعات کا بائیکاٹ صرف خواہش آیئے۔ عملی مظاہرہ کریں

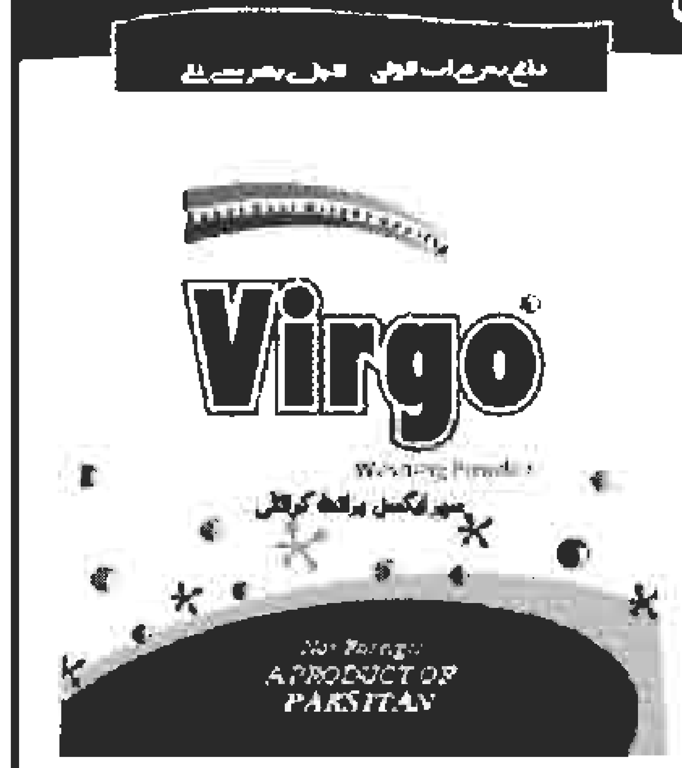

داغ نہ رہے اب کوئی کپڑے پھر سے نئے

وِرگو® واشنگ پاؤڈر

(سپر ایکسل برائٹ کوالٹی)

معیار -/199 والا
-/49 روپے کی بچت
کے ساتھ
1kg
Rs. 150/-
1/2 Kg
Rs. 75/-

ملک بھر سے ڈسٹری بیوٹرز درکار ہیں صرف مالدار پارٹیاں رجوع کریں

فری ہوم ڈلیوری کے لئے کراچی 0334-3922268، فیصل آباد 0333-8365613

سیالکوٹ 0301-6156026، کھاریاں 0300-6230067 ساہیوال 0301-7890748

یہاں دستیاب ہے لاہور: منصورہ بک سنٹر منصورہ گیٹ، کراچی۔ گوشہ عافیت، سرگودھا شاہین شاپنگ مال سیٹ لائٹ ٹاؤن

V.P کے ذریعہ بھی منگوا سکتے ہیں

دوکاندار رابطہ کریں S.M کارپوریشن فیصل آباد موبائل: 0333-8365613

تحریکِ تجدّد اور متجدّدین (۵)

حافظ محمد زبیر

مصطفیٰ کمال پاشا

پیدائش اور نسب نامہ

مصطفیٰ کمال کا اصلی نام 'مصطفیٰ' تھا اور بعض روایات کے مطابق انہیں نوعمری میں ہی ان کے ریاضی کے استاذ نے ریاضی میں ان کی مہارت کے سبب 'کمال' کا لقب عطا کیا تھا' جس سے وہ 'مصطفیٰ' سے 'مصطفیٰ کمال' بن گئے' جبکہ بعض تذکرہ نگاروں کا کہنا ہے کہ مصطفیٰ نے اپنے لیے 'کمال' کا لقب معروف ترکی شاعر 'نامق کمال' سے متاثر ہو کر اختیار کیا تھا۔

'پاشا' کا لفظ ترکی زبان میں ملٹری یا سول آفیسر مثلاً جنرل یا گورنر کے عہدے کے لیے بولا جاتا ہے۔ مصطفیٰ کمال کو 'پاشا' کا لقب ان کے ملٹری عہدے یا جنرل کے عہدے پر فائز ہونے کی وجہ سے دیا گیا' جیسا کہ پاکستان میں پرویز مشرف کو عموماً جنرل پرویز مشرف کہہ دیا جاتا تھا۔ مصطفیٰ کمال پاشا کو 'اتاترک' کا لقب بھی دیا گیا ہے جس کا معنیٰ 'بابائے ترک' ہے۔

مصطفیٰ کمال کی ولادت ۱۸۸۱ء میں سلطنت عثمانیہ کے ایک علاقہ 'سلونیکا' میں ہوئی۔ ان کے والد کا نام علی رضا افندی اور والدہ کا نام زبیدہ ہانم تھا۔ شیخ عبداللہ عزام کے بقول ایک روایت یہ بھی ہے کہ مصطفیٰ کمال کا نسب نامہ محفوظ نہیں ہے' یعنی اس کی ماں کا نام تو زبیدہ ہانم ہے لیکن اس کے باپ یا دادا کا علم نہیں ہے کہ وہ کون تھا؟ مصطفیٰ کمال کے قریبی دوست فالح رفقی نے یہ بات نقل کی ہے کہ میں نے ایک دن مصطفیٰ کمال کو یہ بات کہتے ہوئے اپنے کانوں سے سنا ہے کہ وہ علی رضا افندی کا مذاق اڑاتے ہوئے کہہ رہا تھا کہ یہ میرا باپ نہیں ہے۔ بعض تذکرہ نگاروں کے مطابق مصطفیٰ کمال اتاترک کا باپ حسین آغا نامی شخص تھا جو اپنی قومیت کے اعتبار سے ترک کی بجائے بلغارین یا سربین یا رومانی تھا۔ فتحی بشیر بلعاوی نے اپنے

مقالہ 'الرجل الصنم' میں علم الانسان (Anthropolgy) کی روشنی میں بعض حقائق کو واضح کرتے ہوئے مصطفیٰ کمال کے نسب نامہ کو مشکوک قرار دیا ہے۔

ابتدائی تعلیم اور گریجویشن

مصطفیٰ کمال کو ان کی والدہ نے ابتدائی تعلیم کے لیے محلّہ کے ایک مدرسہ میں داخل کروایا لیکن ان کا دل مذہبی تعلیم میں نہ لگ سکا اور اپنے والد کی خواہش پر انہوں نے سلونیکا ہی میں ماڈرن نصاب کے حامل ایک سکول 'شمسی افندی مکتبی' میں داخلہ لیا۔

مصطفیٰ کمال کے والد علی رضا افندی ایک سرکاری ملازم تھے اور بعد ازاں انہوں نے ملازمت کو خیر باد کہہ کر کاروبار شروع کیا۔ مصطفیٰ کمال کے والدین اس سے کاروبار کروانا چاہتے تھے لیکن مصطفیٰ کمال نے اپنے والدین کی خواہش کے برعکس انہیں بتائے بغیر ۱۸۹۳ء میں ایک جونیئر ملٹری ہائی سکول میں داخلے کا امتحان دیا۔ ۱۸۹۶ء میں ان کا ملٹری ہائی سکول میں داخلہ ہوا۔ ملٹری ہائی سکول سے فراغت کے بعد انہوں نے ۱۸۹۹ء میں 'وار کالج' میں داخلہ لیا اور ۱۹۰۲ء میں اپنی گریجویشن مکمل کی۔ بعد ازاں انہوں نے ۱۹۰۵ء میں 'ملٹری سٹاف کالج' سے بھی گریجویشن مکمل کی۔

ملازمت اور کیریئر

گریجویشن کے بعد مصطفیٰ کمال دمشق میں موجود سلطنت عثمانیہ کی فوج میں بطور 'سٹاف کیپٹن' بھرتی ہوئے۔ یہاں انہوں نے ایک انقلابی جماعت 'وطن و حریت' میں بھی شمولیت اختیار کی جو سیاسی اصلاحات کی دعویدار تھی۔ اسی جماعت سے مصطفیٰ کمال نے خلافت عثمانیہ کو ختم کرنے کے لیے ایک عسکری انقلاب لانے کی فکر پھیلانے کی ابتدا کی' باوجودیکہ وہ خود خلافت عثمانیہ کا ایک تنخواہ دار فوجی افسر تھا۔ ۱۹۲۰ء میں انہیں 'سینئر کیپٹن' کے عہدے پر ترقی دے دی گئی۔ اسی دوران مصطفیٰ کمال نے اپنی سینئر لیڈر شپ پر تنقید کرنا شروع کر دی جس کی وجہ سے ۱۹۰۸ء میں انہیں ریلوے میں انسپکٹر کی ذمہ داری پر تعینات کر دیا گیا۔ ۱۹۱۰ء میں انہیں دوبارہ البانیا میں بطور لیفٹیننٹ تعینات کیا گیا۔ ۱۹۱۱ء میں وزارت جنگ میں ان کو ایک ذمہ داری سونپی گئی اور ۱۹۱۲ء میں انہیں لیبیا میں جاری جنگ میں بھیج دیا گیا۔ یہ جنگ اٹلی اور ترکی کے مابین جاری تھی۔ ۱۹۱۳ء میں ان کا صوفیا میں ملٹری اتاشی کے طور پر تقرر کیا گیا اور

۱۹۱۴ء میں لیفٹیننٹ کرنل کے عہدے پر ترقی دی گئی۔ ۱۹۱۷ء میں انہیں سیکنڈ آرمی کے لیے کور کمانڈر کے طور پر منتخب کیا گیا۔ انہوں نے ۸ جولائی ۱۹۱۹ء کو سلطنتِ عثمانیہ کی فوج سے استعفا دیا اور سلطنت نے ان کی گرفتاری کے احکامات جاری کیے۔ ۲۳/اپریل ۱۹۲۰ء کو مصطفیٰ کمال نے 'گرینڈ نیشنل اسمبلی' کی بنیاد رکھی۔ ۵ اگست ۱۹۲۱ء کو گرینڈ نیشنل اسمبلی کی طرف سے مصطفیٰ کمال کو 'کمانڈر ان چیف' کا عہدہ دیا گیا اور اس عہدے کے تحت مصطفیٰ کمال نے یونانیوں سے جنگ کر کے ان سے ترکی کے مقبوضہ علاقے بازیاب کروا لیے۔ ۳ مارچ ۱۹۲۴ء کو 'خلافت' کے ادارے کا خاتمہ کر دیا گیا اور اس کی پاورز 'گرینڈ نیشنل اسمبلی' کو منتقل کر دی گئیں۔ مصطفیٰ کمال اتاترک نے اپنے تئیں خلافت عثمانیہ کو 'جمہوریہ ترکیہ' میں تبدیل کر دیا' لیکن یہ جمہوریت ایسی ہی تھی کہ خود مصطفیٰ کمال اتاترک لگاتار چار دفعہ اس جمہوریہ ترکیہ کے صدر منتخب ہوتے رہے اور تادمِ وفات جمہوریہ کے صدر رہے۔

جنگی خدمات

۱۹۱۳ء میں 'جالیبولی' کی جنگ میں بلغاریہ کو شکست دی۔ ۱۹۱۵ء میں 'دردنیل' کی جنگ میں کرنل کی حیثیت سے انگلینڈ کو بدترین شکست سے دوچار کیا اور اس کے اعزاز میں انہیں جنرل کے عہدے پر فائز کر دیا گیا۔ ۱۹۱۷ء میں 'قفقاس' کی جنگ میں روس سے سلطنتِ عثمانیہ کے کئی ایک شہر آزاد کروائے۔ ۱۹ مئی ۱۹۱۹ء کو بحیرہ اسود کے کنارے 'جنگ آزادی' کے لیے پڑاؤ ڈالا۔ اس جنگ کا مقصد عثمانی خلفاء و سلاطین سے آزادی حاصل کرنا تھا۔ ۱۹۲۰ء میں 'ازمیر' کی جنگ میں یونانیوں کو شکست دی اور سلطنت عثمانیہ کے کئی ایک علاقے واپس لیے۔ اس کے بعد ۲۳/اپریل ۱۹۲۰ء کو 'گرینڈ نیشنل اسمبلی' کا اجلاس بلوایا اور انہیں اس اسمبلی کا صدر مان لیا گیا اور 'کمانڈر ان چیف' کا عہدہ دے دیا گیا۔ ۱۹۲۲ء میں مصطفیٰ کمال اتاترک نے برطانوی اور فرانسیسی افواج کو ترکی کی سرزمین سے مار بھگایا جس کی وجہ سے انہیں عوامُ النّاس میں غیر معمولی شہرت حاصل ہوئی' یہاں تک کے مشہور مصری شاعر احمد شوقی نے ان کی تعریف میں ایک قصیدہ لکھا۔ لیکن بعد میں جب مصطفیٰ کمال اتاترک کے ''کمالات'' کا ظہور ہونا شروع ہوا اور انہوں نے خلافت اسلامیہ کے ادارے کو ختم کر دیا تو احمد شوقی نے اس کی مذمت کرتے ہوئے اپنے ان اشعار سے رجوع کر لیا اور یہ اشعار کہے:

الهند والهة' ومصر حزينة تبكی عليك بمدمع سحاح
والشام تسأل والعراق وفارس أمحا من الأرض الخلافة ماح

''ہندوستان حواس باختہ ہے اور مصر غمگین ہے اور یہ دونوں تجھ پر بہت زیادہ آنسو بہانے والی آنکھ سے رو رہے ہیں۔ شام سوال کر رہا ہے اور عراق اور فارس بھی پوچھ رہے ہیں۔ کیا اس زمین سے خلافت کو مٹا دیا ہے ایک مٹانے والے نے؟''

دینی افکار و نظریات

مصطفیٰ کمال اتاترک نے ۱۹۲۳ء میں ترکی کی پارلیمنٹ کا افتتاح کرتے ہوئے کہا کہ اب ہم بیسویں صدی میں ہیں اور ہمیں ایسی کتاب کی اتباع کی ضرورت نہیں ہے جس کے موضوعات 'تین و زیتون' ہیں۔ مستشرق آرمسٹرانگ نے لکھا ہے کہ مصطفیٰ کمال نے دوستوں میں کئی دفعہ یہ بات کی کہ وہ ترکی سے دین اسلام کی بنیادیں تک اکھیڑ دینا چاہتا ہے۔

استاذ انور الجندی کے بقول مصطفیٰ کمال نہ تو مجاہد تھا اور نہ ہی مصلح تھا' بلکہ وہ اتحادی افواج کا تتمّہ تھا۔ استاذ انور الجندی نے مصطفیٰ کمال اتاترک کو ایک صیہونی یہودی ایجنٹ قرار دیا ہے۔ فتحی بشیر البلعاوی نے مصطفیٰ کمال کو 'یهود الدونمه' میں سے ایک قرار دیا ہے اور اس کے ثبوت کے لیے کئی ایک حقائق پیش کیے ہیں۔ 'یهود الدونمه' سے مراد یہود کا وہ گروہ ہے جو اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کرتا ہو لیکن حقیقت میں یہودی ہو اور اپنے اسلام کے اظہار سے اس کا اصل مقصود دینِ اسلام کو نقصان پہنچانا ہو۔ 'الدونمه' کا لقب عثمانیوں نے سترہویں صدی میں ان یہود کو دیا تھا جو خلافتِ عثمانیہ کے علاقے 'سلونیکا' میں تھے اور اپنے اسلام کا اظہار کرتے تھے۔ مصطفیٰ کمال کی پیدائش بھی اسی علاقے میں ہوئی تھی۔ 'atajew' نامی ویب سائیٹ میں مصطفیٰ کمال کے یہودی ہونے کے بارے کچھ شواہد پیش کیے گئے ہیں۔

فتحی بشیر بلعاوی نے اپنے مقالہ میں مصطفیٰ کمال پر یہ بھی الزام عائد کیا ہے کہ اس کی زندگی کے مطالعہ سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ وہ تین چیزوں میں غرق تھا: عورت' شراب اور بڑا بننے کا جنون۔ فتحی بشیر بلعاوی نے اس کی شراب نوشی اور عورتوں سے تعلقات پر مفصل گفتگو کی ہے۔

دشمن دین قوانین کا نفاذ

یکم مارچ ۱۹۲۶ء کو ترکی میں 'ترکش پینل کوڈ' کو ضابطہ فوجداری کے طور پر نافذ کیا گیا جو

'اٹالین قانون' سے ماخوذ تھا۔ ۱۴ اکتوبر ۱۹۲۶ء کو اسلامی عدالتیں بند کر دی گئیں۔ اسی تاریخ میں ترکی کا دیوانی قانون بھی نافذ کیا گیا جو سوئٹزر لینڈ کے دیوانی قانون سے ماخوذ تھا۔ اس قانون کے مطابق عورتوں کا وراثت میں مردوں کے برابر حصہ تسلیم کیا گیا اور انہیں اپنے شوہروں کو طلاق دینے کا حق بھی دیا گیا۔ طلاق کے لیے یہ بھی ضابطہ مقرر ہوا کہ وہ عدالت میں ہی دی جائے گی۔ ۱۹۲۵ء میں ایک قانون کے ذریعے انگریزی ہیٹ کو رواج دیا گیا اور سرکاری ملازمین کے لیے اسے لازم قرار دیا گیا۔ ۱۹۲۸ء میں ترکی کے دستور سے یہ بات نکال دی گئی کہ ترکی ایک اسلامی مملکت ہے۔ ۱۹۲۹ء میں ایک قانون کے ذریعے ترکی زبان میں لکھی گئی کتابوں کی عربی حروفِ ہجاء میں نشر واشاعت ممنوع قرار پائی اور ترکی زبان کی کتابت کے لیے لاطینی حروف کو لازم قرار دیا گیا۔ ۱۹۳۴ء میں ایک قانون کے ذریعے عورتوں کو مردوں کے برابر سیاسی حقوق عطا کیے گئے اور ۱۹۳۵ء کے عمومی انتخابات میں ۱۸ خواتین کو پارلیمنٹ ممبر کے طور پر منتخب کیا گیا۔ جرمنی کے قوانین سے ماخوذ 'قانونِ تجارت' کا نفاذ کیا گیا۔

۱۹۲۴ء میں وزارتِ اوقاف کو ختم کر دیا گیا۔ ۱۹۲۵ء میں وزارت اوقاف کے تحت مساجد کو بند کر دیا گیا۔ ۱۹۳۱ء اور ۳۲ء میں مساجد کی تعداد کو محدود کر دیا گیا۔ ۳۰۰ کے قریب سرکاری خطیب تیار کیے گئے تا کہ وہ جمعہ کے خطبات میں 'زراعت' 'کاریگری اور ریاستی سیاست کے بارے میں لوگوں کو آگاہ کریں۔ استنبول شہر کی دو بڑی مساجد و مدارس میں سے ایک مسجد 'آیا صوفیا' کو میوزم بنا دیا گیا جبکہ دوسری بڑی مسجد 'مسجد الفاتح' کو سرکاری گودام بنا لیا گیا۔ ۱۹۳۵ء میں جمعہ کی چھٹی کی بجائے اتوار کی چھٹی کا اعلان کیا گیا۔ ۱۹۳۳ء میں استنبول یونیورسٹی میں شریعہ کالج کو مستقل طور پر بند کر دیا گیا۔ تمام کالجز سے عربی اور فارسی زبان میں تعلیم ختم کر دی گئی۔ اسلامی عیدوں عید الفطر اور عید الاضحیٰ کو لغو قرار دیا گیا۔

مصطفیٰ کمال کے حکم پر عربی میں اذان پر پابندی عائد کی گئی اور ترکی زبان میں اذان کو رائج کیا گیا۔ پہلی کلاس سے لے کر یونیورسٹی تک مخلوط تعلیم کو لازمی قرار دیا گیا اور عوامی مقامات پر عورتوں کے حجاب اور دوپٹے پر قانونی پابندی عائد کر دی گئی۔ امریکہ سے ماہرین تعلیم بلوا کر ایک نصابِ تعلیم مقرر کیا گیا اور اسے تمام قدیم و جدید مدارس اور سکولز کے لیے لازم قرار دیا گیا۔ شکیب ارسلان کا کہنا ہے کہ مصطفیٰ کمال کی حکومت فرانسیسی اور انگلینڈ کی طرز کی سیکولر حکومت نہیں تھی بلکہ ان سے بھی دو ہاتھ آگے تھی' کیونکہ فرانس اور انگلینڈ میں مذہب اور

ریاست میں جدائی کے باوجود کبھی بھی ریاست کی طرف سے نہ تو انجیل کے رسم الخط میں مداخلت کی گئی اور نہ ہی چرچ کو لغو قرار دیا گیا' جبکہ مصطفیٰ کمال کی حکومت مذہب اور دینِ اسلام کی دشمن حکومت تھی' جیسا کہ روس کی حکومت کا معاملہ ہے جس نے مذہب کو جڑ سے اکھیڑنے کی کوشش کی۔

روایتی صوفی ازم کو ختم کیا گیا اور صوفیاء کے سلاسل پر پابندی عائد کر دی گئی۔ بعض خانقاہوں کو میوزیم میں تبدیل کیا گیا۔ مجسمہ سازی کو رواج دیا گیا اور ۱۹۲۷ء میں 'State Art and Sculpture Museum' کی بنیاد رکھی گئی۔ روایتی مغربی میوزک 'اوپرا' اور 'بیلیٹ' کو رواج دیا گیا۔ تھیٹر کو بھی عام کیا گیا اور فلم انڈسٹری پر خصوصی توجہ دی گئی۔ ہجری تقویم کی جگہ مسیحی تقویم جاری کی گئی۔ تعددِ ازواج پر پابندی لگائی گئی' وغیرہ ذالک۔ مصطفیٰ کمال کے ان اقدامات کو بعد ازاں 'کمال ازم' اور 'اتاترک ازم' کا نام دیا گیا۔

وفات

جگر اور اعصاب کی تکلیف کی وجہ سے ۱۰ نومبر ۱۹۳۸ء کو وفات پائی۔ بعض تذکرہ نگاروں کے مطابق انہیں یہ تکالیف شراب نوشی کی کثرت کی وجہ سے لاحق تھیں۔ ترکی میں ہی انہیں 'انقرہ' میں دفن کیا گیا۔ فتحی بلعاوی کے بقول مصطفیٰ کمال نے اپنے مرنے سے پہلے یہ وصیت بھی کی تھی کہ اس کی نماز جنازہ نہ پڑھائی جائے۔

خلاصہ کلام

مذکورہ بالا بحث کے نتیجے میں مصطفیٰ کمال پاشا کے ڈکٹیٹر یا دشمن اسلام ہونے یا الحاد میں کوئی شک وشبہ نہیں ہے۔ تعجب تو اس پاکستانی ڈکٹیٹر پر ہوتا ہے جو مصطفیٰ کمال پاشا کو اپنا آئیڈیل قرار دیتا تھا کہ وہ مصطفیٰ کمال کی طرح پاکستان کے ساتھ کیا کرنا چاہتا تھا؟ مصطفیٰ کمال پاشا جیسے لوگوں کے بارے میں تبصرہ کے لیے درج ذیل قرآنی آیات کی تلاوت ہی کو ہم کافی سمجھتے ہیں:

﴿وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ ۚ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿٨٥﴾ كَيْفَ يَهْدِي اللّٰهُ قَوْمًا كَفَرُوْا بَعْدَ اِيْمَانِهِمْ وَشَهِدُوْٓا اَنَّ الرَّسُوْلَ حَقٌّ وَّجَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿٨٦﴾ اُولٰۗىِٕكَ

جَزَآؤُهُمۡ اَنَّ عَلَیۡهِمۡ لَعۡنَةَ اللّٰهِ وَالۡمَلٰٓئِکَةِ وَالنَّاسِ اَجۡمَعِیۡنَ ﴿۸۷﴾

’’اور جو کوئی دین اسلام کے علاوہ کوئی اور دین چاہے گا تو وہ (اللہ کے ہاں) ہرگز قبول نہ کیا جائے گا‘ اور ایسا شخص آخرت میں خسارہ پانے والوں میں سے ہوگا۔ ایسے لوگوں کو اللہ تعالیٰ کیسے ہدایت دیں جنہوں نے ایمان لانے کے بعد اور یہ گواہی دینے کے بعد کہ رسول (ﷺ) حق ہیں‘ کفر کیا اور ان لوگوں کے پاس واضح نشانیاں بھی آ چکی تھیں۔ پس اللہ تعالیٰ ایسے ظالموں کو ہدایت نہیں دیں گے۔ ایسے ظالموں کی جزا تو یہ ہے کہ ان پر اللہ کی لعنت ہو اور فرشتوں کی لعنت ہو اور تمام نوعِ انسانی کی لعنت ہو۔‘‘

مصادر و مراجع

۱۔ الرجل الصنم‘ فتحی بشیر البلعاوی‘ الجامعة الإسلامية‘ فلسطين‘ ۲۰۰۸ء

۲۔ ذئب الأناضول‘ مصطفی زین‘ الطبعة الأولی‘ برطانیه‘ ۱۹۹۱ء

۳۔ اعلام واقزام فی میزان الاسلام‘ جلد ۱‘ ڈاکٹر سید بن حسین العفانی‘ دار ماجد عسیری‘ جده

۴۔ اردو دائرہ معارف اسلامیہ‘ جلد ۱‘ دانش گاہ پنجاب‘ لاہور‘ طبع اول ۱۹۶۴ء

۵۔ انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر‘ مولانا ابوالحسن علی ندوی‘ مجلس تحقیقات و نشریات اسلام‘ کراچی۔

6-http://www.saaid.net/arabic/199.htm

7-en.wikipedia.org

8-ar.wikipedia.org

9-http://www.ataturk.com

10-http://www.atajew.com/

❁❁❁

وَلِلّٰهِ الۡاَسۡمَآءُ الۡحُسۡنٰی فَادۡعُوۡهُ بِهَا

علم و حکمت کا گنج گرانمایہ۔ سینکڑوں موضوعات کا خزانہ

عظیم تاریخی

اِشاریہ

خوشخبری

ماہنامہ ’’الحق‘‘ کا ۴۵ سالہ عظیم تحقیقی اشاریہ (انڈکس) چھپ کر منظر عام پر آ چکا ہے

حسب ہدایات و نگرانی:

حضرت مولانا سمیع الحق صاحب مدظلہ

ماہنامہ الحق

مرتب: جناب شاہد حنیف

ادارت: مولانا راشد الحق سمیع

دار العلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک

ماہنامہ الحق کے ۴۵ سال میں شائع ہونے والے ۴۸۸ شماروں کے ۳۳۵۶۴ صفحات میں ۱۵۰۰ مصنفین کے ۹۰۰۰ مقالات و نگارشات قرآن و حدیث‘ فقہ‘ سیرت و سوانح‘ شعر و ادب‘ تقابل ادیان‘ جدید سائنسی علوم و فنون‘ نئے اکتشافات بہ اسلامی نقطہ نظر اور ۱۰۰۰ کے قریب کتابوں پر تبصروں و دیگر موضوعات پر سینکڑوں مقالات و کتب سے آگہی کا ۳۲۵ موضوعات پر مشتمل اشاریہ = ضخامت : ۵۵۲ صفحات

مؤتمر المصنفین ‘جامعہ دار العلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک‘ ضلع نوشہرہ

Ph: 0923- 630435-630340 Fax 0923- 630922- Email: editor_alhaq@yahoo.com

سیرتِ خیر الانام صلی اللہ علیہ وسلم

بانیٔ تنظیم اسلامی و داعیٔ تحریک خلافت پاکستان

محترم ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

کے پانچ فکر انگیز خطابات

1. فلسفۂ دین میں نبوت و رسالت کا مقام و مرتبہ
2. نبی اکرم ﷺ پر تکمیل نبوت و رسالت کے مظاہر
3. انقلابِ نبویؐ کا مرحلہ اوّل کردار سازی کا نبوی طریق
4. انقلاب اسلامی میں باطل سے تصادم کا مرحلہ اوّل
5. انقلابِ اسلامی میں باطل سے تصادم کے مراحل

دو DVDs پر مشتمل پیک، قیمت 120 روپے (علاوہ کوریئر چارجز 100 روپے)

مکتبہ خدام القرآن لاہور

قرآن اکیڈمی، K-36 ماڈل ٹاؤن، لاہور فون: 3-35869501-42-92+

ای میل: maktaba@tanzeem.org ویب سائٹ: www.tanzeem.org

وقت کے تقاضوں کی تکمیل...

ہمدرد ایک صدی سے زیادہ نہ صرف آپ کے دکھ اور تکلیف میں فرحت و تسکین بخش رہا ہے بلکہ آپ کا ہمدم اور خیر خواہ بھی ہے۔ انسانیت کی خدمت اور پرورش کے لئے نہایت وسیع اقسام کی ہربل اور طبی مصنوعات موجود ہیں، جو صحت بخش ہونے کے ساتھ شفا بخش بھی ہیں۔

ہمدرد اس دور کے تقاضوں کی تکمیل، ترقی یافتہ سائنسی طریقوں کی مدد سے کرنے کے لئے سرگرم کار ہے۔

صحت انسانی کی بقاء اور بیماریوں کے اس سفر کے ساتھ ساتھ "ہمدرد" نے انسان دوست ادارے کی حیثیت سے تعلیم اور ثقافت کے فروغ میں بھی کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں۔

ہمدرد لیباریٹریز (وقف) پاکستان

ISO 9001: 2008 & ISO 22000: 2005 CERTIFIED

Al-Majeed, Hamdard Centre, Nazimabad No. 3, Karachi-74600, Pakistan. Tel: [illegible] Fax: [illegible] Email: [illegible]
Website: www.hamdard.com.pk